ہندوستان میں
مسلم دورِ حکومت
کا خاتمہ
اسباب و علل
www.KitaboSunnat.com
ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی

ہندوستان میں

مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ

اسباب و علل

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی

ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی

ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ۔ اسباب و علل

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی

اشاعت : 2007ء

قیمت : -/100 روپے، 5 ڈالر

طباعت : نیو انڈیا پرنٹرز، نئی دہلی

ناشر : ایم۔ آر پبلی کیشنز

2695، گلی کالے خاں، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔

ISBN:81-88413-44-5

Dr. M. Muzaffaruddin Farooqui
2572N Mallard Ln
Round Lake Beach, IL 60073
Ph: (847)245-7488, Cell: (847)541-3336

E-mail: farooqui35@hotmail.com

M.R.PUBLICATIONS

2695, Kaley Khan Street, Kucha Chelan,
Darya Ganj, New Delhi-110002
Cell: 9810784549
E-mail: addus26@hotmail.com

Hindustan me Muslim Daur-e-Hakumat Ka Khatma

by: Dr. Mohammad Muzaffaruddin Farooqui   Rs. 100/- $ 5.00

انتساب

مردمجاہد سبھاش چندر بوس کے نام

جس نے کہا تھا

افراد کی قربانی سے قومیں زندہ ہوتی ہیں

اگر کل میں اپنے ملک کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں تو آج مجھے مر جانا ہوگا

کہ میرا وطن آزادی اور عظمت سے ہم کنار ہو سکے۔

یہ کہتے ہوئے

شاید ان کا وجود تو پلاسی کے میدان میں تھا

لیکن ان کا دل

سرنگاپٹم کی "شکست فاتحانہ"

سے اُٹھنے والی نوائے سرمدی پر لگا ہوا تھا۔

سوانحی خاکہ

نام : محمد مظفر الدین فاروقی

تاریخ ومقام پیدائش : ۹رنومبر ۱۹۳۵ء کھمم پلی، ضلع میدک، آندھرا پردیش۔انڈیا

والد کا نام : محترم شیخ مہتاب پٹیل (شہید)

والدہ کا نام : محترمہ غوثیہ بیگم (مرحومہ)

تعلیم : پی۔ایچ۔ڈی (کیمسٹری) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔انڈیا
ایم۔ایس۔سی (کیمسٹری) عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔انڈیا

پیشہ : لکچرر کیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۶۲۔۶۴)
سائنٹفک آفیسر، ریجنل ریسرچ لیبارٹری، حیدرآباد (۶۴۔۶۷)
پوسٹ ڈاکٹر فیلو، اکران یونیورسٹی، اکران۔امریکہ (۶۷۔۶۸)
کلینیکل کیمسٹ، ہولی فیملی ہاسپٹل، شکاگو۔امریکہ (۶۸۔۹۵)

سماجی خدمات : صدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی ایسوسی ایشن آف شکاگو (۱۹۸۷۔۲۰۰۳)
سکریٹری جنرل، انڈو اسلامک فاؤنڈیشن آف امریکہ

تخلیقات : تین ملک ایک کہانی (افسانے) ناموں کا اغوا (افسانے)

شریک حیات : بلقیس بیگم

اولاد : ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ثمینہ غوثیہ ریف، زبیر احمد فاروقی، افشاں نکہت
فاروقی، ذاکرہ صدف فاروقی (پوتی)، زکریا رشید ریف (نواسہ)، جواد احمد
فاروقی (پوتا)، مرجان ہدیٰ فاروقی (پوتی) اور فرقان احمد فاروقی (پوتا)

بھائی : محمد ریاض الدین فاروقی (حیدرآباد)، محمد نجم الدین فاروقی (امریکہ)
محمد جلال الدین فاروقی (امریکہ)، محمد عارف الدین فاروقی (حیدرآباد)
اور محمد افتخار الدین فاروقی (مرحوم)

بہن : خالدہ ادیب خانم (امریکہ) اور فہمیدہ انیس خانم (امریکہ)

ترتیب

پیش لفظ	شبیہ احمد	7
ابتدائیہ	محمد مظفر الدین فاروقی	11
باب اوّل		16
مغلیہ سلطنت کا زوال		
باب دوم		46
پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء		
باب سوم		88
سلطنت آصفیہ کا زوال اور سقوط حیدر آباد ۱۹۴۸ء		

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی کے احساسات اور برصغیر ہند کی تاریخ سے انکی دلچسپی کا بیش قیمت نمونہ ہے۔ ڈاکٹر فاروقی ایک عرصہ سے شکاگو میں مقیم ہیں اور تعمیر و ترقی کے نت نئے مرحلوں سے گزرتے رہے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں قیام کے باوجود وہ آج بھی اپنے وطن اور اسکی خوشبو و احساسات سے مکمل طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان جذبات و احساسات کو آج بھی اپنی سوچ اور فکر پر طاری کیے ہوئے ہیں جو ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کی بدولت پیدا ہوئے تھے۔ وہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے برصغیر ہند کا بٹوارہ، تشکیلِ پاکستان اور اسکے مختلف مراحل اور ۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدرآباد نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس کے اثرات کو برداشت بھی کیا۔ سخت ترین قسم کی بوجھل تبدیلیوں اور سیاسی اور اقتصادی حالات کے چیلنج کو قبول کیا، اور نئے راستے تلاش کیے۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہندوستان کی سیاست کی بساط پر اہم تبدیلیوں کا باعث ہوا۔ اس کے اسباب چاہے کچھ بھی رہے ہوں، یہ ایک حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کی شخصیت کے بارے میں مورخین کے الگ الگ خیالات ہیں، چاہے اس کے لیے اس کی مذہبی پالیسی ذمہ دار ہو یا حکومت کے خلاف سر اُٹھانے والے علاقائی عناصر کے خلاف سخت رویّہ۔ ہندوستان کی تاریخ سے واقف لوگ اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس کے انتقال کے بعد مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ اس کے وارث شہزادوں کی نااہلیت رنگ لائی۔ اور انہیں ڈوبنے سے کوئی نہیں بچا سکا۔ اور تقریباً ۱۵۰ برس بعد ہی ۱۸۵۷ء میں اس سلسلہ کے آخری فرمانروا سراج الدین بہادر شاہ کو اسی کے اجداد کے بنائے ہوئے مقبرہ ہمایوں سے انگریز افواج کی محض ڈیڑھ سو سپاہیوں پر مشتمل ٹکڑی نے گرفتار کر لیا۔ جو مغل سلطنت کی تاریخ کا ایک انتہائی المناک واقعہ تھا۔ ڈاکٹر مظفر الدین صاحب کا یہ خیال ٹھیک ہے کہ مغلوں کی اس

بربادی کے لیے جہاں ان بادشاہوں کی نااہلی کو دخل تھا وہیں معاشرہ کا ایک عام انحطاط خاص طور پر حکمران اور جاگیردار طبقہ کی اوباشی، سازشوں کے لامتناہی جال اور ذاتی مفادات کا تحفظ بھی اس کے لیے اتنے ہی ذمہ دار تھے۔ لیکن مغلوں کی اس شکست کو ہی مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے سے تعبیر کرنا غالباً صحیح نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر فاروقی کی یہ کتاب دراصل شکاگو (امریکہ) کے ایک مضافاتی شہر کی پبلک لائبریری میں ۲۸ رمئی، ۲۵ رجون اور ۲۷ راگست ۲۰۰۶ء کو دیئے گئے تین مختلف خطبات کی مجموعی شکل ہے، جسے انھوں نے بالترتیب (۱) مغلیہ سلطنت کا زوال (۲) پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور (۳) سلطنت آصفیہ کا زوال اور سقوطِ حیدرآباد ۱۹۴۸ء کے عنوانات سے مرتب کیا ہے۔

مندرجہ بالا تینوں خطبات میں انکا دوسرا خطبہ، جو اس کتاب کا دوسرا باب بھی ہے یعنی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء زیادہ وقیع اور جامع ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم سے ۹۰ سال پہلے ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی سوچ پر اگر کسی واقعہ کا سب سے زیادہ اثر ہوا تھا تو وہ ۱۸۵۷ء کے واقعات تھے جسے کچھ انگریز مورخین نے محض چند سپاہیوں کی بغاوت (Mutiny) کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو کچھ نے اسے غدر کا نام دیا لیکن بی ڈی ساورکر جیسے مورخین نے اسے ہندوستان کی آزادی کی پہلی لڑائی کہا۔ اس واقعہ کے مختلف رموز پر ڈاکٹر فاروقی نے تفصیل سے بات کی ہے۔ ہندوستانی عوام پر عمومی طور پر اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں خاص طور پر اس سانحہ اور ۱۹ ر مارچ ۱۸۵۷ء کو ہوئے سقوط دہلی اور اسکے بعد انگریزوں کی طرف سے کھیلی گئی خون کی ہولی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ دہلی کے محلے کے محلے خالی ہو گئے۔ اس کے کچھ برس بعد ہندوستانی مسلمانوں میں خاص طور پر شمالی ہند میں جو دو مختلف تحریکیں تعلیم کے میدان میں شروع ہوئیں ان کا تعلق بالواسطہ طور پر ۱۸۵۷ء کے واقعات سے تھا۔ وہ چاہے سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی طرف سے چلائی گئی علی گڑھ تحریک ہو یا مولانا محمود الحسن، مولانا قاسم نانوتوی اور دیگر علماء کرام کی کوششوں سے دارالعلوم دیوبند کا قیام ہو۔ گو کہ ان دونوں تحریکات کے مقاصد جداگانہ تھے، اور ان کے قائدین نے ۱۸۵۷ء کی تحریک اور اس کے ہولناک نتائج

سے بالکل متضاد حل تلاش کیے تھے، لیکن یہ بھی تاریخ کا ایک اتفاق ہے کہ سر سید احمد خاں اور مولانا قاسم نانوتوی، دونوں قائدین نے اپنی ابتدائی تعلیم کے اسباق دہلی کالج کے استاد مولانا مملوک علی سے ہی حاصل کیے تھے۔ یہ دونوں تحریکیں اپنے مقاصد اور خمیر کے تعلق سے چاہے کتنی ہی مختلف رہی ہوں لیکن دونوں ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلم سماج میں آئی تبدیلیوں اور ایک قسم کی نشاۃ ثانیہ کی ترجمانی کرتی ہیں، اور دہلی کالج کے قیام اور اس سے پیدا ہوئی سماجی فکر کا کلی نتیجہ تھیں۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے واقعات کی روشنی میں ڈاکٹر مظفر فاروقی نے ان تبدیلیوں کو محسوس تو کیا ہے لیکن ان پر کوئی تفصیلی بحث نہیں کی ہے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے تعلق سے بیش بہا تفصیلات جمع کی ہیں، لیکن ایک کمی اس ضمن میں بری طرح کھٹکتی ہے، جس کا ذکر ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان معلومات کے حصول میں صرف ثانوی مآخذ پر اکتفا کیا ہے۔ خاص طور پر خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب، یا عاشور کاظمی و سلیم قریشی کی کتب وغیرہ۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ڈاکٹر صاحب اپنے وسائل کا سلسلہ دراز کر کے یورپ اور خاص طور پر انگلینڈ کی لائبریریوں میں موجود بے انتہا قیمتی مآخذ سے بھی استفادہ کرتے۔ دوسرے یہ کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا جو سب سے روشن پہلو ہے وہ اس کی ساجھی وراثت اور مشترکہ جدوجہد تھی جس میں ہندوستان کے ہندو مسلمانوں نے کندھے سے کندھا ملا کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی تھی، اور ہندوستان کے ہر طبقہ نے اس میں حصہ لے کر اسے ہندوستان کی آزادی کی پہلی لڑائی قرار دیا تھا۔ اس پہلو کو تھوڑا اور اجاگر کرنے کی ضرورت تھی، خاص طور پر اس کا تعلق سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے تو بالکل الگ تھا۔

جہاں تک کتاب کے تیسرے اور آخری باب بہ عنوان سلطنت آصفیہ کا زوال اور سقوطِ حیدرآباد کا تعلق ہے، یہ کتاب کا انتہائی بیش قیمت حصہ ہے، جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنی شہ رگ کے قریب محسوس کرتے ہوئے بھی ایک غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے تحریر کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کی یہ کوشش قابل تعریف بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ کئی بار ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے بڑے مورخ بھی جب اپنے آپ سے وابستہ واقعات کا ذکر کرتے ہیں تو جذباتی دھاروں میں بہہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے خود کو اس امتحان میں ڈالا بھی اور کامیابی کے ساتھ نکالا بھی۔

مگر یہ بات انکی کتاب کے پہلے باب یعنی مغل سلطنت کے زوال اور کتاب کی مجموعی فکر کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی۔میری نظر میں اس کتاب کا عنوان مسلم دور کا خاتمہ نہ ہوکر مغل دور کا خاتمہ، اسباب وعلل ہونا چاہیے تھا، کیونکہ چاہے وہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہندوستان میں آئی سیاسی افراتفری ہو یا ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی طاقتوں کی شکست اور انگریز حکمرانوں کی جیت، یا اس تمام عرصہ میں تاریخ کے بے شمار نشیب وفراز، یہ سب ہندوستانی سماج کے زوال واضمحلال کی تاریخ ہے۔اسے محض مسلم دور حکومت سے تعبیر کرنا تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔اگر ہم تاریخ کو مذہبی دائروں میں مقید کرکے جائزہ لیں تو پھر پانی پت کے میدان میں ظہیر الدین محمد بابر کے ہاتھوں ابراہیم لودھی کی ذلت آمیز شکست اور پٹھان سلسلہ کی حکومت کے خاتمہ، شیر شاہ سوری کے ہاتھوں مغل بادشاہ نصیر الدین ہمایوں کی شکست اور اس طرح کے بے شمار تاریخی حقائق کو کس خانے میں رکھیں گے۔

کل ملاکر زیرِ نظر کتاب جدید ہندوستان میں ایک مخصوص مسلم زاویہ نظر کو سمجھنے کی ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔اور اس ضمن میں قاری کو نت نئے زاویئے تلاش کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔

شبیہ احمد

۳۱رمئی ۲۰۰۷ء

ڈپٹی ڈائریکٹر، انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ

۳۵، فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی

نئی دہلی

اس کے کتاب کے عنوان کے بارے میں محترم شبیہ احمد صاحب نے جو سوال اٹھایا ہے اس پر مزید گفتگو ہوسکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلم دور حکومت کا خاتمہ۔اسباب وعلل عنوان کیوں منتخب کیا گیا ہے اس کی وضاحت ہم نے ابتدائیہ میں کردی ہے۔(فاروقی)

ابتدائیہ

''ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ۔ اسباب و علل'' نام کی کتاب پیش خدمت ہے۔ اس کتاب میں اورنگ زیب کے انتقال ۱۷۰۷ء سے لیکر نظام حیدرآباد میر عثمان علی خان کی حکومت آصفیہ سے دست برداری ۱۹۴۸ء تک کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔ سہولت کی خاطر کتاب کو ۳ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب سلطنت مغلیہ کے زوال کی داستان ہے۔ دوسرا باب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کی ناکامی کے اسباب پر مشتمل ہماری تاریخ کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ اور تیسرا باب ہندوستان کی آخری مسلم حکومت سلطنتِ آصفیہ کے زوال کی روداد ہے۔ چونکہ سلطنت آصفیہ حیدرآباد کو مغل اقتدار کے باقیات کا درجہ دیا گیا تھا۔ لہذا ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کے خاتمے کی داستان زوال حیدرآباد کے تذکرے کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔ اس لئے ہم نے اس عنوان کے تحت مغل سلطنت کے زوال اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے ساتھ سلطنت آصفیہ کے زوال کے اسباب کو بھی جوڑ دیا ہے۔

اس کتاب کے یہ باب دراصل میرے ۳ خطبات کی تحریری شکل ہے۔ یہ خطبات شکاگو (امریکہ) کے ایک مضافاتی شہر شام برگ (Schaumberg) کی پبلک لائبریری میں بالترتیب ۲۸ رمئی ۲۰۰۶ء، ۲۵ رجون ۲۰۰۶ء اور ۲۷ راگست ۲۰۰۶ء کو دیئے گئے تھے۔ شام برگ کی لائبریری میں اربابِ اُردو کی جانب سے ہر ماہ کے چوتھے اتوار کو اردو محفل کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس کی تاسیس ایک ادبی محفل کے طور پر چند سال قبل ہوئی تھی۔ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں اردو ادب کی نامور شخصیت محترمہ رضیہ فصیح احمد صاحبہ کا نام سرفہرست ہے۔ بعدازاں اس کے انتظامی امور کی ذمہ داری میرے عزیز دوست اور اُردو ٹائمز شکاگو کے مشہور کالم نگار امین حیدر صاحب نے سنبھال لی۔ امین حیدر صاحب کی دور اندیشی نے ان

محفلوں کو خالص ادبی جہت سے اونچا کر کے علمی اور تاریخی میدان کی طرف موڑ دیا۔ پھر اُردو ٹائمز کے ایک اور صاحب قلم شاعر اور کالم نگار انجم گوہر اور طنز و مزاح کے مقبول شاعر حشمت سہیل بھی امین حیدر کے معاونوں میں شامل ہو گئے۔ ان حضرات کی شرکت نے ان محفلوں کو نظم وضبط سے مالا مال کیا اور ایک انجمن کی شکل دے دی۔

امین حیدر صاحب میری تاریخ سے دلچسپی سے واقف تھے۔ انہوں نے مجھے توجہ دلائی کہ ارباب اُردو کی کسی ایک محفل میں تاریخ پر گفتگو کی جائے۔ اور اتفاق سے یہ خود میرے دل کی آواز تھی۔ مجھے احساس تھا کہ ہماری جوان نسل ہمارے تاریخی اثاثے سے نابلد ہوتی جا رہی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلم دور حکومت کے بارے میں خاص طور پر موجودہ ہندوستان میں ایک مجرمانہ اغماض برتا جا رہا ہے۔ اکثر جامعات میں عہد وسطیٰ کی تاریخ کے صرف ۳ رخ پر توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ کہ بابر ایک بیرونی شخصیت تھی جس نے ہندوستان میں بہ زورِ شمشیر ایک استبدادی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا مزاج سامراجی تھا۔ اور نتیجہ میں فاتح اور مفتوح کے بیچ ایک ناقابل عبور خلیج پیدا ہوئی اور یہ ہماری تاریخ کا ایک منحوس باب ہے۔ پھر اسی خاندان میں اکبر اعظم پیدا ہوا۔ اس نے اپنی مذہبی رواداری اور لبرل پالیسی سے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ پھر تاریخ کے افق پر اورنگ زیب نمودار ہوا۔ اس نے اکبر اعظم کی پالیسی کو اُلٹ دیا جس کی بنا ہندوستان کا سوادِ اعظم مغل سلطنت سے اس قدر ناراض ہوا کہ اورنگ زیب کے انتقال کے چند ہی برسوں کے اندر مغل سلطنت کا عظیم قصر زمین بوس ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد کی کتاب 'اورنگ زیب۔ ایک نیا زاویہ نظر' سے میں نے اپنے خطبات کی تیاری میں خاصہ استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب کا ایک اقتباس دیکھئے کتنا برمحل ہے۔

"اشوک اور اکبر سے بھی وسیع تر ہندوستان کا نقشہ بنانے والا۔ اسی ملک میں اُپجا (ہندی لفظ معنی پیدا ہونا) ہوا اور یہیں کی آب و ہوا میں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے گزر کر اسی زمین کی مٹی میں رُل مل جانے والا یہ خالص ہندوستانی حکمران اتنا برا نہ ہوتا اگر اسے آج کے آئینہ میں دیکھنے کی مجبوری نہ ہوتی۔ آج کی یہ مجبوری محمد علی جناح اور اس ملک کی تقسیم ہے جو ایک

ناسور کی طرح رستا رہتا ہے۔ آخر ہم کب تک تاریخ کو اس کے چوکھٹے سے ہٹا کر آج کی دھول سے اٹے ہوئے آئینہ میں دیکھتے رہیں گے؟ کب تک ہم اپنے من گڑھت افسانوں کو آنے والی نسلوں کے لئے تاریخ کی صورت میں پیش کر کے انسانوں کو جانوروں کی طرح آپس میں لڑاتے رہیں گے۔"

یہ اقتباس میری فکر سے بہت ہم آہنگ ہے۔ تاریخ کو جب میں اٹھارویں صدی کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھتا ہوں تو میرے اندر اکثر ایک زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ احباب کی محفلوں میں جب اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے تو میرے اندر کا یہ زلزلہ اکثر احباب کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ کچھ تو منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور کچھ برملا کہتے ہیں کہ اب ہمیں اُس تاریخ سے کیا مطلب۔ مستقبل کی فکر کرنی چاہئے۔ ماضی کے کھنڈرات میں آبلہ پائی سے کیا حاصل۔ بہر حال یہ بات اپنی جگہ کتنی ہی سچائی کی حامل ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ماضی سے اغماض برت کر قومیں اس پودے کی مانند ہو جاتی ہیں جس کی جڑیں زمین کے اندر ہی اندر کاٹ دی گئی ہوں۔ جب شاخیں سوکھ جائیں گی تو پتے خود بخود زرد ہو جاتے ہیں۔ کلوروفل کی آفرینش کے لئے جڑوں سے آنے والے تغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلا خطبہ محترمی حسن الدین صاحب کی صدارت میں، دوسرا خطبہ شکاگو کے ایک دانش ور منیر صدیقی صاحب اور تیسرا خطبہ محبی ڈاکٹر صادق نقوی سابق پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں دیا گیا تھا۔ ان حضرات کے اور میرے محترم دوست ڈاکٹر عابد اللہ غازی بانی اقرا ایجوکیشنل فاؤنڈیشن شکاگو کے گراں قدر مشوروں کی روشنی میں ان خطبات کو مناسب ردوبدل اور اضافے کے بعد کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے مراحل میں جن دوست احباب اور ادب نواز دانشوروں نے ساتھ دیا ہے ان کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ محترم شبیہ احمد صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر انڈین کونسل فار ہسٹاریکل رِیسرچ (گورنمنٹ آف انڈیا) نئی دہلی کا میں بے حد ممنون ہوں کہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر ایک عالمانہ پیش لفظ تحریر فرمایا ہے۔

کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت کے سارے مراحل ڈاکٹر پروفیسر قمر رئیس صاحب کی نگرانی میں انجام پائے ہیں۔ حسن طباعت اور گیٹ اپ کا اعلیٰ معیار ڈاکٹر صاحب کے

ذوق نظر اور توجہ کا بین ثبوت ہیں۔ ساتھ ہی میں اس کتاب کے ناشر ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز کے عبدالصمد صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے کمپوزنگ اور طباعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ناشر کی غیر معمولی احتیاط کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ امریکہ میں بیٹھ کر دہلی سے کتاب چھپوائی جائے اور وہ کمپوزنگ (کتابت) کی غلطیوں سے پاک ہو۔ جن دوستوں نے ان خطبات کو کتابی صورت میں پیش کرنے کے لئے بہ اصرار اپنی دلچسپی کا اظہار کر کے مجھے تقویت پہنچائی ہے ان میں سرفہرست اعجاز ہاشمی، محترمہ شگفتہ ہاشمی، امین حیدر، ڈاکٹر قدوس خان، حشمت سہیل، انجم گوہر، جاوید اسلم ڈاکٹر خورشید خضر اور حیدر آباد دکن کے قدیر زماں ہیں۔

اگر میری شریک حیات بلقیس فاروقی ہر مشکل مرحلے میں میرے ساتھ تعاون نہ کرتیں تو لکھنے لکھانے کے صبر آزما کام سے عہد براہونا آسان نہ ہوتا۔ ظاہر ہے گھریلو ضرورتوں کے لئے جو وقت دیا جانا چاہیے اس کا بڑا حصہ تخلیقی اور تصنیفی کام اور مطالعہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ مصنف یا تخلیق کار اپنے دل پسند کام میں مصروف رہ کر خوش وخرم رہتا ہے۔ لیکن وقت کی قربانی تو خاندان کو دینی پڑتی ہے۔ اس بارے میں اپنوں کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ سو بیگم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے احساس ہے کہ ان کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کے عنوان کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شام برگ پبلک لائبریری کے پروگرام میں گفتگو کے لئے مجھے جو عنوان دیا گیا تھا وہ یہ تھا ''ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنی حکومت کیسے کھوئی'' میں نے اس عنوان کو بدل کر ''ہندوستان میں مسلم دور حکومت کا خاتمہ۔ اسباب وعلل'' رکھا ہے۔ اور اسی عنوان سے یہ کتاب پیش کی جارہی ہے محترم شبیہ احمد صاحب نے پیش لفظ میں اس عنوان کی موزونیت پر شبہ ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ''مسلم دور کا خاتمہ۔ اسباب وعلل'' کے بجائے ''مغل دور کا خاتمہ۔ اسباب وعلل'' ہونا چاہیے تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عنوان ''مسلم دور کا خاتمہ'' نہیں ہے ''مسلم دور حکومت کا خاتمہ'' ہے۔ مسلم دور اور مسلم دور حکومت میں بہ ظاہر کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ لیکن مسلم دور ایک ایسی علامتی ترکیب ہے جو حکمران طبقے کے ساتھ ساتھ عوام الناس کے مختلف طبقات پر محیط ہو سکتی ہے۔ اور ''مسلم دور حکومت'' ایک مخصوص اصطلاح

ہے جس کا اطلاق میری نظر میں مسلمان بادشاہوں کے عہد حکومت پر ہوتا ہے۔ چونکہ اس کتاب میں مغل سلطنت کے زوال اور آخری مغل حکمران کی معزولی کے ساتھ مملکت آصفیہ کے آخری حکمران کی معزولی کی داستان بھی جوڑ دی گئی ہے۔ لہذا اس تاریخی بیانیہ کو ''مسلم دور حکومت کا خاتمہ۔ اسباب وعلل'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ اگر عنوان مغل دور حکومت کا خاتمہ رکھا جاتا تو ہم اس کتاب میں تیسرا باب بہ عنوان مملکت آصفیہ کا زوال اور سقوط حیدرآباد شامل نہیں کر سکتے تھے۔

اب ایک دوسرا سوال جو پیش لفظ میں اُٹھایا گیا ہے وہ ہے کہ ''تاریخ کو مذہبی دائروں میں مقید کر کے جائزہ لیں تو ایک مسلمان بادشاہ اگر دوسرے مسلمان بادشاہ سے بزور شمشیر حکومت چھین لے تو ایسے تاریخی واقعہ کو کس خانے میں فٹ کیا جائے۔ اس سوال کا تسلی بخش جواب شاید ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس سوال میں مذہب اور تاریخ کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مسلم دور حکومت کا بیان قطب الدین ایبک (۱۱۹۳ء) سے شروع کیا جائے تو مسلمان بادشاہوں کی جنگی مہمات کا بیان اُسی دور کے حوالے سے لکھ سکتے ہیں۔ بالکل اِسی طرز فکر کو اپنا کر اگر ہندو دورِ حکومت کا بیان چندر گپت موریا (۳۲۲ قبلِ مسیح) سے شروع کریں تو اسی دور کے حوالے سے ہندو حکمرانوں کی جنگی مہمات کا بیان لکھ سکتے ہیں۔ ان داستانوں کو لکھتے ہوئے ہمیں کسی بھی مذہبی چوکھٹے کی حاجت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ دور ملوکیت کے بنیادی عوامل ایک جیسے ہیں چاہے وہ دورِ حکومت مسلمان بادشاہوں کا ہو یا ہندو حکمرانوں کا یا پھر بدھ مت کے ماننے والے بادشاہوں کا۔ ڈاکٹر تارا چند صاحب نے کہا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کی پوری مدت میں ہندوستان کی حکومت کے سربراہ مسلمان تھے۔ لیکن حکومت اسلامی نہ تھی۔ مسلم حکمرانوں کی حکومت یا طرز حکومت کو دینی یا اسلامی حکومت کہنا صریحاً غلط ہوگا اس لئے مسلم دور حکومت والی اصطلاح کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور حکومت کو ہم مذہب کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی

۷ رجولائی ۲۰۰۷ء

شکاگو (امریکہ)

باب دوم

مغلیہ سلطنت کا زوال

پسِ منظر

ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کے خاتمے کی داستان مفاد پرست مرکز گریز قوتوں کی باہمی آویزش کی عبرت انگیز داستان ہے۔ جب یورپ کی استعماری قوتیں ہندوستان کی سرزمین کو نشانہ بنا رہی تھیں تو اس وقت ہندوستان کے سیاسی افق پر مفاد پرست مرکز گریز عناصر کا تیرہ بخت کھیل شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ نتیجہ میں دہلی کی عسکری، مالی اور سیاسی قوت بکھر گئی اور بیرونی استعماریت کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ علامہ اقبال کے قول ''قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی'' کے مطابق ہندوستان میں مسلم اقتدار کی موت واقع ہو گئی۔ یہ اٹھارویں صدی کا عبرت ناک انقلاب ہے جس کے حقیقی اسباب کو جاننے کے لئے بلاتعصب مذہب وملت قومی نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اٹھارویں صدی کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس دور کے ۳ واضح رخ دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۔ مغلیہ سلطنت کا زوال، ۲۔ حکمران طبقے کا منفی کردار، ۳۔ بیرونی طاقت کی ریشہ دوانیاں۔ ان تینوں عوامل کے امتزاج سے جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسے سیاسی غلامی کا نام اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ حکمران طبقہ کی ناعاقبت اندیشی اور نااہلی کی وجہ سے 'سونے کی چڑیا' زنجیرِ غلامی میں جکڑ دی گئی لیکن پہلے سو سال یعنی ۱۷۵۷ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک چمن زار کے کسی ذی روح نے اس غلامی کو قبول نہیں کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، حصول آزادی کی جدوجہد کا نقطہ عروج ہے۔ جب مسلمانوں نے جو اتفاق سے حکمران طبقے کا غالب عنصر تھے آزادی کے لئے اپنا سب کچھ

قربان کر دیا۔ اگرچہ اس جنگ میں ہندوستانی بشمول مسلمان پسپا ہوئے اور سیاسی اقتدار کو مکمل طور پر کھو دیا لیکن ہمارے آباؤ اجداد نے غلامی پہ راضی ہو کر مجاہدانہ سرگرمیوں سے منہ نہیں موڑا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد نصف صدی تک غلامی کا جوا اُتارنے کی جدوجہد ہندوستان کے طول وعرض میں جاری رہی۔

مسلم اقتدار کے خاتمے کے اسباب کو تلاش کرنا ہو تو ہمیں پہلے مغلیہ سلطنت کے زوال پر سرسری نظر ڈالنا چاہیے۔ ازاں بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا جائزہ لینا چاہیے۔

مغلیہ سلطنت کا زوال:

ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اُردو کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اٹھارویں صدی عیسوی کی پہلی صبح کا سورج طلوع ہوا تو برعظیم میں رقبے، آبادی اور دولت کے اعتبار سے ایک ایسی عظیم سلطنت قائم تھی جس کے حدود کابل وکشمیر اور کوہ ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیوں سے لے کر کم وبیش راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے۔ اسی (۸۰) سالہ اورنگ زیب عالمگیر اس عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ تھا۔ خود برعظیم کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی عظیم سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی۔ مغلوں نے برعظیم کو نہ صرف سیاسی اتحاد سے روشناس کر کے ایک نیا قومی تصور دیا تھا بلکہ ایک وسیع تہذیبی ہم آہنگی پیدا کر کے ایسا سیاسی وتہذیبی ڈھانچہ بھی تیار کیا تھا جس میں معاشرے کی تخلیقی وفکری صلاحیتیں پھل پھول سکیں۔ سترھویں صدی اس تہذیب کا نقطۂ عروج ہے اور اٹھارویں صدی اس عظیم سلطنت کے زوال کی داستان ہے''[1]

پچاس سال تک اورنگ زیب کے ہاتھ میں اس مملکت کی باگ ڈور رہی جس کی ہمسری کا دعویٰ اس دور کی ساری دنیا کی مملکتوں میں سے کوئی بھی نہ کر سکتی تھی۔ اورنگ زیب کی شخصیت اور کردار کے حوالے سے ڈاکٹر تاراچند تحریک آزادی ہند میں لکھتے ہیں

''بہ حیثیت حکمران اپنے انتہائی پیچیدہ فرائض کے ادا کرنے میں اس نے جس لگن محنت ہمت اور استقلال کا اظہار کیا وہ اس کو تاریخ کے ایک عدیم

المثال حکمران کی حیثیت سے ممتاز کرتا ہے۔اس کی ذاتی زندگی ایک نیک انسان کا نمونہ تھی۔وہ ان تمام برائیوں سے بری تھا جو ایشیاء کے بادشاہوں اور شہزادوں میں عام طور سے پائی جاتی تھیں۔وہ سادگی کی زندگی بسر کرتا تھا۔نہیں! نہیں! بلکہ وہ زندگی کی ضروریات کا بھی تارک تھا۔وہ کھانے پینے میں لباس اور زندگی کی تمام ضروریات میں روکھے پھیکے، موٹے بھدے پر قناعت کرتا تھا۔بادشاہت کے نظم ونسق کے بھاری کاموں میں مشغول ہونے کے باوجود اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرآن پاک کی نقل کرنے اور ٹوپیاں سینے کے لئے وقت نکال لیتا تھا۔اپنی آخری وصیت میں اپنے تجہیز و تکفین کے اخراجات کے متعلق اس کی ہدایت یہ تھی کہ چار روپے اور دو آنے ٹوپیوں کی قیمت میں سے بچ رہے ہیں ان کو میرے کفن پر خرچ کرو۔تین سو پانچ روپے اس اُجرت سے بچے ہیں جو قرآن پاک کی نقل کرنے کے صلہ میں مجھ کو ملے ہیں وہ میرے بٹوے میں ہیں، اسے میری موت کے دن فقراء میں تقسیم کرو۔اس کے روزمرہ کے اوقات اپنے اوپر سخت گیری پر مبنی تھے۔وہ ۲۴ گھنٹوں میں صرف ۳ گھنٹے سونے کے لئے دیتا تھا۔وہ جس طرح اپنے اوپر سخت تھا۔اسی طرح دوسروں سے بھی کام لینے میں سخت گیر تھا۔اپنے وسیع نظم ونسق کے جزئیات تک کی نگرانی کرتا تھا۔اور ہر فوجی مہم کی وہ بذات خود رہبری کرتا تھا۔اس کے پاس نہ ختم ہونے والی توانائی اور کبھی نہ مغلوب ہونے والی قوت ارادی تھی۔"[2]

ڈاکٹر تاراچند مزید لکھتے ہیں کہ "بے پناہ محنت، راتوں کی نیند حرام کر کے باخبر رہنے کی جفاکشی اپنی خشک زاہدانہ پاکبازی، بحیثیت منتظم اپنی شک سے بالاتر اہلیت اور ممتاز مدبر اور جنرل ہونے کے باوجود اس کی یعنی اورنگ زیب کی حکومت ناکامیاب رہی۔"[3] ڈاکٹر تاراچند نے اورنگ زیب کی حکمت عملی کو ناکام قرار دیا ہے۔ڈاکٹر تاراچند ہی نہیں تقریباً سارے تاریخ نویسوں نے ایک زبان ہو کر مغل سلطنت کے زوال کا سبب اورنگ زیب کی حکمت عملی کو قرار دیا ہے اور یہ الزام عائد کیا ہے کہ اس کی مذہبی اور دیگر پالیسوں کے نتیجے

میں مغل سلطنت پر زوال آیا۔ اورنگ زیب کے بارے میں لکھتے وقت جن مورخوں نے جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے ان کا ذکر ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، پروفیسر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسیٹی نے خدابخش توسیعی لکچر ۱۹۸۶ء کے دوران کیا ہے۔ فرماتے ہیں" آشرواد ی لال، ایشوری پرشاد، شری رام شرما، آرسی مجمدار اور وی ایس اسمتھ وغیرہ جیسے مورخوں نے بھی وسطی عہد پر کچھ کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اورنگ زیب پر لکھتے وقت ان مورخوں نے بھی اپنے جانبدارانہ رویہ کا اظہار جانے یا انجانے میں کچھ اس انداز سے کیا کہ پڑھنے والا اُسے ایک کٹر مسلمان اور ظالم بادشاہ ہی سمجھا"[4] ان مورخوں کا ذکر کرنے کے بعد ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد مزید فرماتے ہیں۔"۱۹۶۰ء کے آس پاس ہمیں کچھ ایسے غیر جانبدار اور صاف ذہن مورخوں کی لکھی ہوئی تحریریں اور کتابیں ملتی ہیں جن میں اورنگ زیب کے بارے میں کافی غیر جانبدارانہ باتوں کا علم ہوتا ہے جن میں عرفان حبیب، ایس نورالحسن، ہربنس مکھیا، اطہر علی اور ستیش چندر وغیرہ کے نام کافی اہم ہیں"[5] ہربنس مکھیا کے حوالے سے پرساد صاحب فرماتے ہیں۔"ہربنس مکھیا اپنی سلجھی ہوئی بے لاگ تحریر میں بتاتے ہیں کہ آرسی مجمدار اورنگ زیب کے ذریعہ توڑے ہوئے مندروں کا تذکرہ تو بڑے زور و شور سے کرتے ہیں لیکن ان حقائق پر چپ سادھ لیتے ہیں کہ اُسی بادشاہ نے برہمنوں اور مندروں کو دان دیا"[6] اطہر علی کے حوالے سے پرساد صاحب فرماتے ہیں"اطہر علی نے ہندوؤں کے سب سے بڑے حمایتی کہلائے جانے والے بادشاہ اکبر اور ہندوؤں کے سب سے بڑے مبینہ دشمن اورنگ زیب کے عہد کے عہدیدارانِ حکومت کی تفصیلات کی تحقیق دستیاب شہادتوں کی بنا پر کی ہے اور یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ اکبر نے اپنے دورانِ حکومت میں سب سے زیادہ ہندوؤں کو نہیں نوازا ہے۔ اس نے حکومتی عہدوں پر اتنی تعداد میں ہندوؤں کا تقرر نہیں کیا جتنی تعداد میں اورنگ زیب نے اپنے دورِ حکومت میں کیئے۔"[7] اور ستیش چندر کے حوالے سے پرساد صاحب یوں فرماتے ہیں کہ"ایک تیسرے رخ کو اجاگر کرنے کا سہرا ستیش چندر کے سر جاتا ہے۔ جنہوں نے جزیہ ٹیکس پر ایک جابندارانہ و سلجھی ہوئی تحریر شائع کی ہے۔ اپنی کتاب میں سب سے پہلے بہت سلیقہ اور ٹھوس ڈھنگ پر انہوں نے اورنگ زیب کا مطالعہ کیا ہے اور اس کی کمزوریاں اور خوبیاں بہت ہی

سلجھے ہوئے اور متوازن انداز میں پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں''[8]

بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے مورخوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال کو اورنگ زیب کی کٹر مذہبی پالیسی سے جوڑ دیا تھا۔ مذکورہ بالا تجزیہ کی روشنی میں اس دعویٰ کا پول کھل جاتا ہے۔ ڈاکٹر پرساد نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب کے بارے میں ایک دوسرے رخ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ رومیلا تھاپر کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ''رومیلا تھاپر نے اپنی کتاب 'مدھیہ کالین بھارت' (وسطی عہد کا ہندوستان) میں انتہائی واضح اور ٹھوس الفاظ میں سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث بجائے اورنگ زیب کے اُس زمانے کے سماجی واقتصادی حالات اور اورنگ زیب کے جانشینوں کو مانا ہے۔''[9]

رومیلا تھاپر نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے کم وبیش ایسا ہی خیال ڈاکٹر اکھلیش جیسوال صاحب نے اپنی کتاب ''اورنگ زیب کے ہندوؤں سے تعلقات'' میں ظاہر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ''مغل سلطنت کے زوال کا عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ یہ تو اورنگ زیب کا کارنامہ ہے کہ اس نے تقریباً ۵۰ سال تک مغل سلطنت کو گرنے سے روکے رکھا۔ اور اگر اورنگ زیب جیسا ستارہ ہندوستان کے افق پر طلوع نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ مغل سلطنت کا زوال بہت پہلے ہی ہو جاتا۔ کیونکہ اگر ہم اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو ہی مغل سلطنت کے زوال کا سبب مانتے ہیں تو بہادر شاہ اول کی اپنائی ہوئی فیاض مذہبی پالیسی کی وجہ سے مغل سلطنت کو استحکام ملنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور مغلیہ سلطنت بتدریج روبہ زوال ہوتی چلی گئی۔''[10]

رومیلا تھاپر اور ڈاکٹر اکھلیش جیسوال صاحب نے جس احساس ذمہ داری اور کھلے دل ودماغ سے اورنگ زیب کے عہد کا جائزہ لیا ہے اس زمرے میں وپن چندر کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ وپن چندر ''وسطی عہد کا ہندوستان'' (مدھیہ کالین بھارت) کے کوآتھر (Co-author) ہیں۔ وپن چندر صاحب لکھتے ہیں ''دنیا میں کسی عہد کے عروج وزوال کی ذمہ داری ایک فرد پر ڈالنا اسی حالت میں سچ ہوگا جبکہ تاریخ کو ہم راجہ رانی کی کہانی مان لیں''[11] سلطنت مغلیہ کے زوال کی ذمہ داری سے ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد اور ڈاکٹر اکھلیش جیسوال کے تجزیہ کی روشنی میں ایک فرد واحد یعنی اورنگ زیب کو بری کر دیا جائے

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ایک مختصر مدت یعنی ۵۰ سال کے اندر اندر اتنی عظیم الشان عسکری قوت اور مالی وسائل کی حامل سلطنت پر زوال آیا۔ اس حقیقت کو جاننے کے لئے ہمیں تاریخ کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی رخ پر نظر ڈالنی چاہیے۔

اقتصادی اور سماجی پس منظر:

دور مغلیہ میں اندرون ملک عظیم صنعتی اور تجارتی ترقی کے باوجود زمین ہی حکومت کی آمدنی کا خاص ذریعہ تھی۔ اکبر کے ابتدائی ۲۰ سالہ عہد تک ملک کی زرعئ زمینات دو حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ ایک حصہ براہ راست شاہی ملکیت میں تھا جس کو خالصہ کہا جاتا تھا۔ خالصہ زمینات کی مالگزاری حکومت کا محکمہ مال وصول کرتا تھا جو شاہی خزانے میں داخل کیا جاتا تھا۔ دوسرا حصہ جاگیر کا تھا جسکی مالگزاری جاگیردار وصول کرتے تھے جس سے منصب داروں، امراء اور فوجی سربراہوں کی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اس میں سپاہیوں کی تنخواہیں اور دوسرے فوجی اخراجات بھی شامل تھے۔ اکبر نے اپنے عہد حکومت کے ۱۹ ویں سال ملک کی ساری زمینات کو خالصہ قرار دے کر کل زمینات سے حاصل ہونے والی آمدنی کو براہ راست شاہی خزانے کی تحویل میں دے دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک انقلابی اقدام تھا۔ اگر اس نظم کو مستقل شکل دے دی جاتی تو کل اراضیات سے حاصل ہونے والا سرمایہ ایک مضبوط اور دیرپا مرکزی سیاسی نظام کے لئے ممدو معاون ہوتا۔ لیکن جاگیردار طبقے میں اس نئے انتظام سے بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ خود اکبر نے جاگیردار اور امراء کو مطمئن کرنے کی غرض سے اپنے آخری دور میں ملکی اراضی کو پھر سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں خالصہ زمین کے رقبے میں مزید کمی کر کے جاگیر کے حصے کو بڑھا دیا گیا۔ یوں اورنگ زیب کو وراثت میں بہت کم زمین ملی جس کی آمدنی حکومتی اخراجات کے لئے ناکافی تھی۔ چنانچہ حکومتی اخراجات پورے کرنے کے لئے اورنگ زیب نے خالصہ زمینات کے رقبے میں تھوڑا اضافہ کیا اور مالگزاری کی شرح بھی بڑھا دی۔ اس انتظام سے کاشت کاروں پر بوجھ بڑھ گیا۔ مالگزاری ادا کرنے کے بعد کاشت کار کے پاس صرف اتنا

کچھ بچ جاتا کہ وہ سال بھر تک اپنی ذاتی اور خاندان کی ضروریات پوری کر سکے۔ لیکن کھیتی باڑی کو ترقی دینے یا وسیع کرنے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں بچتا تھا۔[۱۲]

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں صنعت اور تجارت میں خاطر خواہ ترقی ہوئی لیکن زراعت بدستور جامد اور قدیم طریقہ کار پر چلتی رہی۔ زرعی ترقی کے رک جانے سے خاص طور پر سترھویں صدی کے آخری دہوں میں زمینات کی شرح پیداوار کے گھٹ جانے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ پیداوار کم ہونے کے دو واضح اسباب تھے۔ ایک تو آبادی کے بڑھ جانے سے زرعی زمینات خاندانوں میں تقسیم در تقسیم ہو کر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئیں۔ زمین کی کمی کو پورا کرنے کے لئے کاشت کاروں نے کم زرخیز اور بنجر زمینات کو کاشت کی زمینات میں شامل کر لیا۔ زرخیز اور کم زرخیز زمین کے ملاپ سے پیداوار کی شرح میں اضافہ تو نہیں ہوا لیکن کاشت کار کے زرعی اخراجات بڑھ گئے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ کاشت کار زرخیز زمینات پر صدیوں تک معقول کھاد دیئے بغیر فصلیں اگاتے رہے۔ لہٰذا زرخیز زمینات کی قوت نمو بتدریج کم ہوتی گئی۔ زرعی پس ماندگی نے حکومت کے مالیہ کو بری طرح متاثر کیا۔[۱۳]

مغل سلطنت کے زوال میں اس دور کے حکمران طبقے (زمین دار اور امراء) نے اہم کردار ادا کیا۔ عہدِ وسطیٰ میں زمینداروں کی حیثیت سماجی اور انتظامی نقطۂ نظر سے بہت کلیدی تھی۔ یہ دیہی سماج کی نمائیدگی کرتے تھے۔ حالاں کہ زمیندار کسانوں کا استحصال کرتے تھے اور ان کے باہمی تعلقات اکثر خوش گوار نہیں رہتے تھے۔ پھر بھی تاریخ کے ہر دور میں ایسے علاقے تھے جہاں زمیندار اور کاشت کار کے تعلقات بہتر تھے۔ اور حکومت کی جانب سے دونوں میں سے کسی ایک پر بھی سخت کاروائی ہوتی تو دونوں بغاوت کر سکتے تھے۔ پھر یہ زمیندار فوجی نقطۂ نظر سے بھی بہت اہمیت کے حامل تھے۔ حالانکہ زمینداروں میں آپسی چپقلش ہمیشہ رہی ہے جس کی وجہ سے یہ متحد ہو کر حکومت وقت کے خلاف کبھی بغاوت نہیں کر پائے۔ پھر بھی یہ زمیندار بادشاہ کے لئے فوجی اعتبار سے کسی بھی وقت مسئلہ بن سکتے تھے۔ مرکزی حکومت میں کسی وجہ سے کمزوری آجائے تو اس کا فائدہ براہ راست زمیندار اُٹھاتے تھے۔ وہ مالگزاری روک لیتے جس کی وجہ سے مرکز کا مالیہ کمزور ہو جاتا۔ ہندوستان کا

سماجی ڈھانچہ اس ملک کے جغرافیائی حد بندیوں، لسانی روایات اور ذات پات کی بندشوں کی وجہ سے ہمیشہ علاقائیت کی طرف مائل رہا ہے۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک مضبوط مرکزی حکومت نے مرکز گریز علاقائی احساسات کو دبائے رکھا۔ لیکن مختلف علاقوں میں مقامی راجاؤں اور بڑے زمینداروں میں علاقائی عصبیت کے احساسات ختم نہیں ہوئے۔ زمینداروں نے کبھی علاقائی عصبیت سے آزاد ہو کر ایک ہندوستانی قومیت کے تصور کو نہیں اپنایا۔ اورنگ زیب کے بعد جب مرکزی اقتدار تیزی سے بکھر گیا تو مغلیہ سلطنت کا عظیم سیاسی وحدت کا تصور بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں: ''اٹھارویں صدی کے وسط میں ہندوستان تیزی سے تباہی کی جانب چلا جا رہا تھا۔ سلطنت مغلیہ جس نے دو سو سال تک ہندوستان کے راجاؤں اور باشندوں کو ایک وحدانی مرکزی حکومت کے نظام میں منسلک کر کے متحد رکھا تھا وہ اندرونی اختلاف اور مغرب سے بیرونی حملے کے ہاتھوں زوال کا شکار ہوا تھا۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہو جانے سے نہ صرف سیاسی اتحاد غائب ہو گیا اور خود پرستی نے اپنا گندہ سر اُوپر اٹھایا بلکہ تہذیب اور اخلاق کا عام زوال بھی پھٹ پڑا۔'' [۱۴]

عہد وسطیٰ کے نظام حکومت میں امراء، منصب دار اور جاگیردار طبقات کا مرکز سے فوجی اور ملکی نظم وضبط کی بحالی کے لئے تعاون اور ارتباط ضروری تھا۔ امراء اور منصب داروں کی مخصوص مراعات تھیں، انھیں شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی یا کسی ایک علاقے کی مالگزاری انھیں عطاء کی جاتی تھی۔ منصب دار اور امراء کے عہدے موروثی نہیں ہوتے تھے۔ انتظامی ضروریات کے تحت ان کے تبادلے ہوتے تھے۔ اس طریقۂ کار سے بیشتر امیر اور منصب دار غیر مطمئن رہتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں مقامی حکمران طبقے یعنی راجاؤں اور زمینداروں کو اونچا منصب دے کر انھیں امراء کے طبقے میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس طبقے میں زیادہ تر شمالی ہند کے راجپوت تھے۔ ان کے علاوہ امراء اور منصب داروں میں ایرانی، تورانی، افغانی اور ہندوستانی مسلمان تھے۔ اورنگ زیب کے دور حکومت کے ابتدائی ۲۵ سال میں طبقہ امراء میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ لیکن آخری ۲۵ سال کے دوران شیواجی کے انتقال کے بعد اور دکن کی عادل شاہی وقطب شاہی سلطنتوں کے ختم

ہونے پر دکن سے مرہٹہ سردار بڑی تعداد میں اور عادل شاہی وقطب شاہی فوج کے ایرانی اور مقامی مسلمان فوجی سربراہ بھی مغلیہ فوج میں شامل ہو گئے۔ جس کی وجہ سے طبقہ امراء میں پوری شدت کے ساتھ آپسی چپقلش نے سر اُٹھایا۔ جس نے مغل فوج کے ڈسپلین کو بری طرح متاثر کیا۔ یوں بھی فوجی سربراہوں میں مختلف زبان، ذات اور نسل کے لوگ تھے جن میں یکجہتی بنائے رکھنا بہت مشکل کام تھا۔ حالانکہ مغل بادشاہوں نے انھیں تہذیبی وثقافتی رشتے میں پرونے کی پوری کوشش کی لیکن ان مختلف لسانی اور خاندانی عصبیتوں کی بنا پر طبقہ امراء اور منصب داروں میں فکری وحدت اور ایک مرکزی ہندوستانی قومیت کے جذبات پیدا نہ ہوسکے۔ منصب داری نظام میں منصبدار کے معاشی مفادات اُسے عطا کی گئی مالگزاری والی زمین سے وابستہ تھے۔ چونکہ یہ عہدہ موروثی نہیں تھا اور منصب دار کو یہ یقین نہیں رہتا تھا کہ وہ کب تک اس زمین کا مالک رہے گا۔ لہٰذا وہ اپنی زمین سے مالگزاری وصول کرنے سے آگے کی سوچ نہیں رکھتا تھا۔ جب تک تخت سلطنت پر لائق اور باتدبیر حکمران فائز رہے منصب دار اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے دور میں حکمران طبقہ بے قابو ہوگیا۔ اور نتیجہ میں امراء نے قلیل مدت میں زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی ہوس میں کاشت کاروں کا استحصال کرنا شروع کر دیا۔

اورنگ زیب کی دکنی مہمات کے بارے میں بعض مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ۲۵ سالہ فوجی کاروائیوں کی وجہ سے شاہی خزانہ تقریباً دیوالیہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے مالی اعتبار سے ایک دیوالیہ حکومت جسکا زوال یقینی تھا اپنے جانشینوں کے حوالے کی تھی۔ خاص کر عادل شاہی اور قطب شاہی علاقائی حکومتیں مغل سلطنت اور مرہٹوں کے بیچ ایک ڈھال یا غیر جانب دار حکومت (Buffer State) کے طور پر استعمال کی جاسکتی تھیں۔ جغرافیائی اعتبار سے قطب شاہی سلطنت کو بفر اسٹیٹ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا تھا۔ البتہ احمد نگر کی نظام شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی حکومتوں کے علاقے بفر اسٹیٹ کے طور پر استعمال ہوسکتے تھے۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نظام شاہی سلطنت کے سب سے بااثر اور طاقتور امیر ملک عنبر ہی مرہٹوں کے فوجی عروج کا ذمہ دار تھا۔

اکبر نے شمالی ہند اور بنگال کو زیرنگیں کرنے کے بعد دکن کی طرف توجہ کی۔ دریائے تاپتی اور نربدا کے درمیانی علاقے خاندیس میں فاروقی خاندان حکمران تھا۔ اور نربدا کے جنوب میں نظام شاہی سلطنت تھی جس کا پایہ تخت احمد نگر تھا۔ اکبر کی فوجی مہمات کا آغاز فاروقی اور نظام شاہی حکومتوں کے خلاف ہوا۔ شاہ جہاں کے دور میں خاندیس، برار اور احمد نگر کی حکومتوں کے تمام علاقے مغلیہ سلطنت میں ضم ہو گئے۔ ان طویل فوجی مہمات کے دوران مشہور مرہٹہ سردار شاہ جی بھونسلا (شیوا جی کے پتا) اور ہزاروں مرہٹے نظام شاہی فوج میں شامل ہو کر ملک عنبر کے جھنڈے تلے گوریلا جنگ کا تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین بھی بڑھ چڑھ کر مرہٹوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔[15] یہ تھے سیاسی حالات جس کی وجہ سے اورنگ زیب نے مرہٹوں کے ساتھ ساتھ دونوں مسلم حکومتوں کو ختم کرنا ضروری سمجھا۔

ان مہمات کے دوران جیسا کہ خیال ظاہر کیا گیا کہ مغل حکومت مالی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکی تھی۔ لیکن اورنگ زیب کے بیٹوں میں تخت و تاج کے لئے جب خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو تینوں شہزادوں نے شاہی خزانے کے اُن حصوں پر قبضہ کر لیا جو ان کی دست رس میں تھے۔ آعظم (دوسرا بیٹا) نے احمد نگر پہنچ کر اورنگ زیب کی تحویل میں جو خزانہ تھا اس پر قبضہ کر لیا جس کی مقدار کئی کروڑ میں بتائی جاتی ہے۔ محمد عظیم (شہزادے معظم کا بیٹا) مشرقی ممالک کا خزانہ لیکر آگرہ پہنچا اور مرکز کے شاہی خزانے کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا جس کی مقدار ۲۰ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ معظم لاہور، ملتان اور مغربی علاقے کی ساری دولت لے کر آگرہ آ گیا جس کی مقدار بھی کئی کروڑ بتائی جاتی ہے۔ تیسرا بیٹا کام بخش بیجا پور پہنچ گیا اور دکن کے خزانے کو اپنی تحویل میں لے لیا جس کی مقدار بھی کئی کروڑ بتائی جاتی ہے۔[16]

ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے انتقال کے وقت مغلیہ سلطنت مالی اعتبار سے دیوالیہ نہیں ہوئی تھی۔ مشرقی ممالک جو بنگال، بہار، اڑیسہ، الہ آباد، اور اودھ پر مشتمل تھے ان کی آمدنی کئی کروڑ تھی۔ اورنگ زیب کے بعد بھی وہ علاقے مغلیہ سلطنت کو خاطر خواہ مالیہ فراہم کرتے رہے۔ دوسرا علاقہ پنجاب، ملتان، ٹھٹھہ اور کابل

تھا جو اورنگ زیب کے دور حکومت اور اس کے بعد بھی خاصی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ وسط ہند کا علاقہ مالوہ، اکبر آباد، گجرات، اجمیر، خاندیس، برار، بیدر اور اورنگ آباد کی آمدنی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اورنگ زیب کے آخری دور میں ۱۷۰۳ء کے لگ بھگ بیجاپور اور حیدر آباد بھی مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گئے۔ ان علاقوں سے مغلیہ خزانے میں تقریباً ۱۵ کروڑ کی آمدنی کا اضافہ ہوا جو تقریباً پوری سلطنت ہند کے ایک چوتھائی حصے کے برابر تھا۔[۱۷]

اگرچہ کہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کو ایک مرکز کے تحت لانے میں بہت بڑی مالی اور عسکری قوت کو صرف کرنا پڑا تھا لیکن ان فتوحات سے مغل حکومت کو دوہرا فائدہ ہوا۔ ایک تو یہ کہ سارا ہندوستان ایک مرکزی سیاسی قوت کے زیر نگیں آ گیا۔ اگر ہندوستان کا یہ سیاسی نقشہ مزید چالیس پچاس سال تک برقرار رہتا تو پھر گنگا جمنی تہذیب کے زیر سایہ ہندوستانی قومی وحدت کے جو نقوش ابھر رہے تھے وہ پائدار بنیادوں پر مستحکم ہو جاتے کیوں کہ اورنگ زیب نے محدود علاقائی عصبیت کے بل بوتے پر حکمرانی کا دعویٰ کرنے والی منفی قوتوں کو پھلنے پھولنے سے پہلے کچل دیا تھا۔ اس نے مرہٹوں کو اس حال میں چھوڑا تھا کہ ان کے تقریباً تمام مقبوضات حتیٰ کہ کوکن بھی جہاں شیواجی نے اپنا سوراج قائم کیا تھا شاہی فوجوں کے تصرف میں آ چکے تھے۔ ان کے پہاڑی قلعوں کا بھی بڑا حصہ فتح ہو چکا تھا اور صرف چند قلعے ان کے پاس رہ گئے تھے۔ مرہٹہ طاقت ایک مرتب اور منظم حکومت کی حیثیت سے قریب قریب مٹ چکی تھی۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد شیواجی کے پوتے ساہو اور ساہو کے چچا رام راجہ کی بیوہ رانی تارابائی میں بچی کھچی نیم آزاد مرہٹہ حکومت کی جانشینی کے لئے خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ اگر عالمگیر کے بعد ایک اور عالمگیر تخت نشین ہو جاتا تو پھر عین ممکن تھا کہ مرہٹوں کا زبردست فتنہ نہ اُٹھ کھڑا ہوتا اور نہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامراجی عزائم پورے ہوتے۔

سیاسی پس منظر:

مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب میں اُس دور کے سیاسی حالات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اورنگ زیب کے عہد میں مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور پٹھانوں میں ایسے گروہ پیدا

ہوئے جو اپنی خودمختار علاقائی ریاستوں کے قیام کے خواہش مند تھے۔ اورنگ زیب کو بہر حال ان توسیع پسند باغی طاقتوں سے جنگ کرنی پڑی۔ ان جنگوں میں مغلوں کو بے پناہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ کیا جنگوں کے پس منظر میں اورنگ زیب کی نام نہاد مذہبی پالیسی کارفرما تھی؟ ڈاکٹر تاراچند نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اورنگ زیب نے اونچے درجہ کے ہندوؤں کو جو حکومت کا سہارا تھے ناراض کر دیا تھا۔ لیکن ان چھوٹی چھوٹی بغاوتوں سے اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔ ''یہ کہنا مبالغہ ہے کہ اس پالیسی نے مغل سلطنت کے خلاف عام بغاوت کا جذبہ پیدا کیا یا یہ کہ مسلم حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کے لئے لوگوں کو ابھارا۔''[18] پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بغاوتوں کے پس منظر میں کون سے جذبات کارفرما تھے۔ اس بارے میں ڈاکٹر تاراچند ہی وضاحت کرتے ہیں۔ ''ست نامی ہندوؤں کا ایک آزاد خیال طبقہ ۱۶۷۲ء میں بعض چھوٹے چھوٹے ذاتی معاملات کی بنا پر حکومت کے افسران سے مقابلہ کر بیٹھا۔''[18] جاٹوں کی یورش کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''جاٹ زمینداروں نے دوابہ میں جو بغاوت کی وہ کوئی مذہبی یورش نہیں قرار دی جا سکتی۔''[15] اورنگ زیب اور مرہٹہ آویزش کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''مرہٹوں کے کچھ مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ (یعنی شیواجی) ہندو پدشاہی قائم کرنا چاہتا تھا۔ یعنی مغلوں کی شہنشاہیت کے بجائے ہندو راج۔ لیکن مرہٹہ کی پوری تاریخ میں ملک گیری نمایاں طور پر ممتاز نظر آتی ہے۔ یعنی اس سرزمین پر جس میں مرہٹے آباد تھے ان کی ایک باضابطہ حکومت......... شیواجی اور ان کے بعد پیشوا بھی ملک گیری کی مہم تمام قریبی ریاستوں میں چلاتے رہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اور وہ ہندوؤں کو اسی طرح نچوڑ لیتے تھے جس طرح مسلمانوں کو نچوڑ لیتے تھے۔''[19]

سکھ گرونانک کی تعلیمات کے مطابق خدائے واحد کی پرستش کرنے والے ایک صوفیانہ جماعت کے طور پر ابھرے۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں یہ خالص مذہبی فرقہ بتدریج ایک فوجی جماعت میں تبدیل ہوا۔ جہانگیر کو گرو ارجن پر شبہ تھا کہ جانشینی کی کشمکش میں انہوں نے خسرو کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ اس شبہ کی بنیاد پر جہانگیر نے انھیں قید کر دیا تھا۔

گروارجن کے بیٹے گروہرگوبند نے بھی جہانگیر کوناراض کر دیا تھا۔ گروتیغ بہادر مغل اقتدار کے خلاف تھے اور پنجاب میں ہر طرف خوف وہراس پھیلا کر اپنی فوجی طاقت کو مضبوط کر رہے تھے۔ جس کی بنا پر خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے انھیں سزائے موت دی تھی۔ گروتیغ بہادر کو اورنگ زیب کے حکم سے سزائے موت دئے جانے کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت دستیاب نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک انگریز آفیسر مٹیکاف نے پہلی بار اپنی کتاب ''سکھوں کی تاریخ'' میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک دوسرے انگریز مورخ کننگھم نے اس کی تردید کی ہے۔ ایک اور سکھ مورخ بھائی منی سنگھ نے اپنی کتاب بھگت رتناولی، (مطبوعہ ۱۸۹۲ء) میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ایک سکھ نے ہی ان کی اپنی اجازت سے اپنے گرو کا سر کاٹ دیا تھا۔[20] سکھوں کے دسویں اور آخری گروگوبند سنگھ شمالی مغربی پہاڑی علاقے کے ہندوراجاؤں کو مغلوب کر کے شاہی مملکت کے اندر اپنی ایک خود مختار ریاست قائم کر لی۔ جس کی وجہ سے ہندوراجاؤں نے اورنگ زیب سے مدد کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے لاہور کے صوبہ دار اور سرہند کے فوجدار وزیر خان کو گروگوبند سنگھ کے خلاف پہاڑی راجاؤں کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ اس فوجی کاروائی کے دوران گروگوبند سنگھ کی موت ایک پٹھان کے ہاتھوں ہوئی جس کے دو بیٹوں کو گروجی نے مار ڈالا تھا۔[21] ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سکھ بغاوت حصول اقتدار اور ذاتی خودغرضی کے جذبات کی پیدا کردہ تھی۔ اورنگ زیب کو پٹھانوں سے بھی جنگ کرنی پڑی۔ ویسے اکبر اور شاہ جہاں کے دور میں بھی مغل فوج کا ٹکراؤ پٹھانوں سے ہوا تھا۔ ۱۶۶۷ء ایک افغان سردار بھاگو نے محمد شاہ جو ایک شاہی خاندان کے فرد ہونے کا دعوے دار تھا، کی بادشاہت کا اعلان کر کے ایک خودمختار ریاست قائم کر لی۔ افغانوں کی اس کوشش کو ناکام کرنے کے لئے اورنگ زیب نے بخشی امیر خان کو راجپوت سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ روانہ کیا۔ کئی خوں ریز جنگوں کے بعد افغانوں کی بغاوت کو دبا دیا گیا۔ اس علاقے کے انتظام کے لئے ۱۶۷۱ء میں مارواڑ کے حاکم جسونت سنگھ کو فوجدار مقرر کیا گیا۔ ۱۶۷۲ء میں افغانوں نے دوسری بغاوت کی۔ جسے فرو کرنے کے لئے

خود اورنگ زیب کو پشاور جانا پڑا اور تقریباً ڈیڑھ سال تک وہاں ٹھہرے رہنا پڑا۔[۲۲]

مغل بادشاہوں نے جہاں راجپوت ریاستوں کو زیر کیا وہیں دکن کی مسلمان ریاستوں کو بھی ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ اکبر کے دور میں احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت ختم کر دی گئی۔ اورنگ زیب کے دور میں بیجاپور کی عادل شاہی اور گول کنڈے کی قطب شاہی سلطنتوں کو ختم کر دیا گیا۔ مغلیہ اقتدار کے دوسو سالہ دور میں بابر سے لیکر اورنگ زیب تک نہایت اعلیٰ صلاحیت کے حکمران سرزمین ہند کو نصیب ہوئے۔ ان حکمرانوں کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کو ایک مرکزی سیاسی وحدت کا تصور دیا۔ علاقائی مفادات کی حامل چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مرکز میں ضم کر دیا۔ اور مرکز کو کمزور کرنے والی جو بھی باغیانہ طاقت اُبھری خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اُسے سختی کے ساتھ کچل دیا۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اورنگ زیب کے انتقال کے وقت مغل شہنشاہیت کی جانشینی کا کوئی اور دعوے دار مغل شہزادوں کے علاوہ باقی نہ رہا۔

اورنگ زیب کے جانشینوں کا کردار:

اورنگ زیب کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا۔ یہ اٹھارویں صدی کا سب سے اہم واقعہ ہے جس کے بعد پچاس سال کے عرصے میں نااہل جانشینوں کی خانہ جنگی خودغرض اور عیش پرست امراء کی باہمی آویزش اور ملک کے مفاد میں اتحاد کے جذبے کے فقدان نے عظیم مغل سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔

اورنگ زیب نے اپنی حکومت اپنے تین بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں تقسیم کر دی تھی تاکہ جانشینی کا خونی راستہ بند ہو جائے۔ لیکن جیسے ہی اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوئی بھائیوں میں جانشینی کی جنگ چھڑ گئی اس کشمکش میں بڑا بیٹا معظم کامیاب ہو گیا اور بہادر شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر قابض ہو گیا۔ لیکن اس کی حکومت کی مدت بہت مختصر رہی۔ چار سال حکومت کر کے وہ ۱۷۱۲ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد بہادر شاہ کے چاروں بیٹوں میں وراثت کی جنگ شروع ہو گئی۔ حکومت حاصل کرنے کی دھن میں وہ اس قدر

دیوانے ہوگئے کہ بوڑھے بادشاہ کی لاش ایک ماہ تک دفن نہ ہوسکی یہ جنگ آخیر میں دو بھائیوں کے مقابلے پر ختم ہوئی۔ ایک عظیم الشان جو چاروں بھائیوں میں سب سے زیادہ حکمرانی کے لائق تھا۔ اور دوسرا جہاندار شاہ جو ایک عیاش، نفس پرست انسان تھا شاہی فوج کے میر بخشی کی حمایت کی وجہ سے کامیاب ہوگیا۔ جہاندار شاہ کی تخت نشینی سے مغل سلطنت کے زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاندار شاہ کی حمایت کرنے والوں میں ایرانی پارٹی کے لیڈر ذوالفقار علی خان سب سے پیش پیش تھا۔ اور اس امید پر جہاندار شاہ کی مدد کر رہا تھا کہ ایک نکمے بادشاہ کی آڑ میں حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ سکتا ہے۔ ذوالفقار علی خان کی امید بر آئی۔ چنانچہ جہاندار شاہ کی کامیابی سے ایک نیا انتہائی خود غرض عنصر ملکی سیاست میں داخل ہوا۔ اب تک وراثت کی جنگ میں مغل شہزادے بذات خود ایک دوسرے کے مقابل ہوتے تھے۔ ان کا ساتھ دینے والی فوج کے سربراہ شہزادوں کے وفادار اور ان کے احکامات کے تابع ہوا کرتے تھے۔ لیکن جہاندار شاہ اور اس کے بعد والے تخت کے دعوے دار شہزادے پس پردہ چلے گئے فوج کے سربراہ اور امراء اقتدار کے حصول میں اصل مقابلہ کرنے والے ہوگئے۔ جہاندار شاہ ایک عاقبت نا اندیش اوباش اور فضول خرچ حکمران تھا۔ وہ افیون کا عادی اور شراب کا رسیا تھا۔ دن رات اپنی منظور نظر مدخولہ لال کنور کے ساتھ داد عیش دیتا اور شرافت وشائستگی کے سارے حدود توڑ کر مبتذل جنسی افعال میں ملوث رہتا تھا۔ دلی کے اوباش اور ناپسندیدہ عناصر اسے گھیرے رہتے، امراء اور عمایدین کی پگڑیاں اچھلتیں۔ انتظام سلطنت چند ہی ماہ میں بکھر کر تباہ ہوگیا۔ بادشاہ کے اطوار نے سارے معاشرے کو متاثر کیا۔ ابتذال نے شائستگی کی جگہ لے لی۔ اخلاقی قدریں بے وقعت ہوگئیں۔ ۱۱ مہینے کی مختصر سی مدت میں حکومت کا خزانہ خالی ہوگیا۔ مغل شہنشاہیت کے جاہ وجلال کا تصور ہوا ہوگیا۔[۲۳]

اس سیاسی انارکی سے تنگ آ کر سید برادران (حسین علی اور سید عبداللہ) جنھیں سادات بارہیہ بھی کہا جاتا ہے، نے جہاندار شاہ کو ختم کرنے کا ارادہ کرلیا۔ فرخ سیر کو حرم سرا سے نکال کر جہاندار شاہ کے مقابلے میں کھڑا کیا گیا۔ جہاندار شاہ اپنی منظور نظر لال کنور کو لے کر میدان

سے بھاگ نکلا۔ اُسے گھیر گھار کر قتل کر دیا گیا اور فرخ سیر کو ۱۷۱۳ء میں تخت سلطنت پر بیٹھا یا گیا۔ فرخ سیر سازشی ذہن کا سفاک، بزدل اور ظالم انسان تھا۔ بہت جلد سید برادران سے اس کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ سید برادران حکومت کے معاملے اور مالی وسائل پر مکمل اقتدار کا مطالبہ کرتے تھے اور فرخ سیر مکمل حاکمانہ اختیارات استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بزور طاقت وہ سید برادران کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ چنانچہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے فرخ سیر نے سازشوں کا جال پھیلایا۔ انہیں دنوں راجپوتانے میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ بغاوت فرو کرنے کے لئے حسین علی کو شاہی فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے راجپوتانہ روانہ کیا گیا اور ساتھ ہی باغی راجپوت راجہ اجیت سنگھ راٹھور کو خفیہ خطوط لکھے گئے کہ اگر وہ حسین علی کو ٹھکانے لگا دے تو بیش بہا انعامات کے ساتھ راجپوتانے کی باگ ڈور اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکی حسین علی نے اجیت سنگھ راٹھور کو زیر کر لیا۔ اس کے بعد دوسری سازش کی گئی۔ دکن کے صوبہ دار نظام الملک کو واپس بلا لیا گیا۔ اور حسین علی کو صوبہ داری کا پروانہ دے کر دکن روانہ ہونے کا حکم جاری کیا گیا۔ حسین علی راجپوتانے کی بغاوت فرو کر کے جب دکن پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ دکن کے نائب صوبہ دار داود خان کو بھی دکن کا صوبہ دار بنایا گیا ہے۔ اور وہ میدان جنگ میں حسین علی خان کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں نام زد صوبہ دار ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے اور داؤد خان میدان جنگ میں مارا گیا۔ داود خان کو ٹھکانے لگا کر حسین علی انتہائی طیش کے عالم میں دہلی کی طرف لوٹا۔ اس کی فوج میں ۱۱ ہزار مرہٹہ سپاہی تھے جس کی کمان پیشوا بالاجی وشوا ناتھ، سیناپتی کھانڈے راؤ، وبھاوے سنتاجی اور بھونسلہ وغیرہ کر رہے تھے۔ اس فوج نے لال قلعے اور شاہی محل کے اندر پہنچ کر فرخ سیر کے طرف داروں کا قتل عام کیا۔ فرخ سیر کو اندھا کر کے ایک تنگ کال کوٹھری میں چند دن قید رکھا گیا۔ اور بعد ازاں نہایت بے دردی سے اُسے قتل کر دیا گیا۔ فرخ سیر کو قتل کرنے سے پہلے مرہٹوں کو خوش کرنے کے لئے حسین علی نے بادشاہ سے مرہٹوں کے نام دکن کی مالگزاری (چوتھ) وصول کرنے کا پروانہ لکھوا لیا۔ مغل دور کے دو سو پچیس سالہ دور میں پہلا واقعہ ہے جب ایک غیر علاقے کی فوج جو مرہٹہ سپاہیوں پر مشتمل تھی مغلوں کے پائے تخت میں داخل ہو کر شاہی

محل کے اندر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا ہو۔ اور بادشاہ وقت سے مملکت کے ایک مخصوص علاقے کی مالگزاری وصول کرنے کا حق حاصل کیا ہو۔ مغل مرہٹہ آویزش کے تاریخ نویس اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ مرہٹوں نے مغل شہنشاہیت کی جگہ ہندو پدشاہی کے قیام کے لئے اورنگ زیب کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ اگر یہ دعویٰ حقیقت پر مبنی ہوتا تو گیارہ ہزار مرہٹہ فوج کو جس کی کمان خود پیشوا بالاجی وشواناتھ اور سیناپتی کھانڈے راؤ کر رہے تھے اور ساتھ میں دوسرے چوٹی کے مرہٹہ سردار بھی موجود تھے مغل اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے سے کون روک سکتا تھا۔ جو کام شیواجی کے زمانے میں نہ ہو پایا وہ اس وقت ممکن تھا۔ لیکن بقول ڈاکٹر تاراچند "جب حسین علی نے فرخ سیر کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ مرہٹوں کو لے آیا اور بادشاہ کو بے بس کر کے صرف سوراجیہ پر مہر تصدیق ثبت کرا دی جس کا مطالبہ مرہٹے شیواجی کی فتوحات کی بنا پر کرتے تھے۔ بلکہ ان کو چوتھ اور دکن کی سردیش مکھی بھی عطاء کی۔ اگر چہ اس معاملے کی وجہ سے مرہٹہ ریاست کا حکمران اس وقت سے شہنشاہ معظم کا حلقہ بگوش اور ان کا ایک وفادار خادم بن گیا۔ پھر بھی یہ تو ہوا ہی کہ ان کو ان محاصل تک دسترس حاصل ہو گئی اور مملکت کے معاملات میں دخل اندازی کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔"[۲۴] یہاں سوراجیہ کا مطلب ہے مرہٹہ سرزمین پر مرہٹوں کی خودمختار حکومت، مرہٹوں کی ساری جدوجہد کا مقصد یہی سوراجیہ تھا نہ کہ ہندو راج کا قیام۔

فرخ سیر کے دورِ حکومت میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے آگے چل کر برعظیم کی تاریخ کے دھارے کو ناخوش گوار موڑ دے دیا۔ ۱۷۱۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لئے فرخ سیر کے دربار میں اپنی سفارت بھیجی۔ سفارتی عملے میں ڈاکٹر ولیم ہیملٹن بھی شامل تھا۔ اتفاق سے فرخ سیر اس وقت بیمار تھا۔ ڈاکٹر ہیملٹن نے بادشاہ کا علاج کیا اور وہ صحت یاب ہو گیا۔ فرخ سیر نے خوش ہو کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو ساری مطلوبہ تجارتی مراعات دے دیں۔ شاہی فرمان کی رو سے بغیر محصول ادا کے انھیں بنگال میں تجارتی حقوق مل گئے۔ کلکتہ کے اطراف میں مزید زمین مل گئی۔ حیدر آباد کے صوبہ میں بغیر محصول ادا کے تجارت کے حقوق بحال کر دے گئے۔ مدارس میں معمولی کرایہ پر اور سورت

میں دس ہزار روپیے سالانہ ادا کر کے ہر قسم کے محصول سے معافی مل گئی۔ ساتھ ہی کمپنی کے سکے کو ساری مغل سلطنت میں چلانے کی اجازت بھی مل گئی۔ یہ ایسے تجارتی مراعات تھے جس کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی معمولی تاجروں کے زمرے سے نکل کر ہندوستان کی بہت بڑی تجارتی کمپنی میں بدل گئی اور اس کی سالانہ آمدنی میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا۔ کمپنی کے دوراندیش لیکن انتہائی شاطر سربراہوں نے ہندوستان میں رونما ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کو بھانپ لیا۔ اور شاہی عنایات کی وجہ سے حاصل ہونے والے فاضل سرمایے کو فوجی طاقت کے حصول میں لگا دیا۔

فرخ سیر کو تخت سلطنت سے محروم کرنے کے بعد دہلی کا تخت سید برادران کے قبضہ میں تھا۔ فرخ سیر ابھی کال کوٹھری میں قید تھا کہ سید برادران کے دماغ میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ اس حوالے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں۔ ''اس وقت ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ تیموری خاندان کا خاتمہ کر کے ہندوستان پر خاندان سادات کی حکومت قائم کر دی جائے اور حالات یقیناً ایسے تھے کہ اس قسم کا خیال دلوں میں آنا غیر فطری نہ تھا۔ لیکن اغلب خیال یہ ہے کہ اس تجویز کو دو وجوہ سے رد کر دینا پڑا ہوگا۔ ایک یہ کہ ملک کے تمام طاقتور سیاسی گروہ مثلاً تورانی، ایرانی، افغانی، اور راجپوت جو تیموری خاندان کی وفاداری پر متفق تھے، سادات کی بادشاہی کو کسی حال میں قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے اور سادات کے پاس ہرگز اتنی قوت نہ تھی کہ وہ ان سب گروہوں کو بہ جبر اپنی اطاعت پر راضی کر سکتے یا ان کی طاقت کو بزور شمشیر مٹا سکتے .... ان وجوہ سے سلطنت ہند میں ایک نہایت اہم انقلاب ہوتے ہوتے رہ گیا''[۲۵] اب تیموری خاندان میں سے کسی کو بادشاہ بنانا ضروری تھا۔ مگر وہ ایسا شخص ہونا چاہیئے تھا کہ وہ صرف تخت پر بیٹھے اور اس کے نام سے حکومت سیدوں کے ہاتھ میں ہو۔ چنانچہ شاہی محلات سے شاہ عالم بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادے رفیع الدرجات کو پکڑ کر دربار میں لایا گیا اور اُسی لباس میں جو وہ پہنے ہوئے تھا اُسے تخت طاؤس پر بیٹھایا گیا۔ رفیع الدرجات ایک بیس برس کا دق کا مریض تھا۔

رفیع الدرجات کی بادشاہت کے اعلان کے بعد فرخ سیر قتل کر دیا گیا۔ دو ایک ماہ

کے اندر رفیع الدرجات کی بیماری شدت اختیار کرگئی اور اس نے خواہش کی کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بیٹھایا جائے۔ چنانچہ جون ۱۷۱۹ء کو ۳ ماہ کی حکومت کے بعد رفیع الدرجات کو تخت سے اتار کر رفیع الدولہ کو شاہ جہاں ثانی کے لقب سے تخت نشین کیا گیا۔ یہ بھی افیون کا عادی اور بیمار تھا۔ ۳ ماہ بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کے بعد بہادر شاہ کے پوتے روشن اختر کو ۲۸ ر ستمبر ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بیٹھایا گیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بارہ سال کے اندر اندر یہ چھٹا بادشاہ تھا جو مسند حکومت پر بیٹھا۔ محمد شاہ جو تاریخ میں محمد شاہ رنگیلے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۱۷۴۸ء تک تخت سلطنت پر متمکن رہا۔

نئے بادشاہ کی تخت نشینی سے فارغ ہونے کے بعد سید برادران نے اپنے مخالف امراء کو ٹھکانے لگانے کی کاروائی شروع کی۔ سیدوں کے خلاف سب سے زیادہ سرگرم جے سنگھ تھا۔ جے سنگھ اپنا دارالحکومت آنبیر برہمنوں کو دان دے کر زعفرانی لباس پہن کر مرنے مارنے کی شپتھ لے کر فرخ سیر کا بدلہ لینے کے لئے نکل آیا تھا۔

یہاں ہم اس دور کے ایک مخصوص رجحان کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جے سنگھ کا یہ رویہ اس بات کی گواہی ہے کہ مغل خاندان سے راجپوتوں کی وفاداری میں کسی قسم کی کمی نہیں واقع ہوئی تھی۔ اگر اورنگ زیب کی سیاسی پالیسی میں مذہب کی ملاوٹ سے اونچی ذات کے ہندو خصوصاً راجپوت جو فوج اور سول انتظامیہ کا ایک اہم رکن رہے ہیں ناراض ہو گئے ہوتے تو یہ ایسا وقت تھا جب خود مغل انتظامیہ کے چند اراکین مغل بادشاہوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح نچا رہے تھے تو راجپوت ان کا ساتھ دے کر مغل اقتدار کو خاک میں ملا سکتے تھے۔ لیکن جے سنگھ اپنی حکومت کو تیاگ کر ایک مغل بادشاہ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جب تاریخ کے صفحات پر ہم ایسے حقائق کو رقم دیکھتے ہیں تو اٹھارویں صدی کے کج فہم ہندوستانی مورخین کی تاریخی فہم وبصیرت پر ماتم کرنے کے سوائے اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیش رو انگریز تاریخ نویسوں کی تقلید کے سوائے کچھ اور کارنامہ نہیں انجام دیا۔

جے سنگھ کی سرکوبی کے لئے حسین علی خان نے فوجی تیاری شروع کی۔ حسین علی خان کو اس مہم سے باز رکھنے کے لئے اجیت سنگھ والی جودھپور نے بیچ میں پڑ کر صلح کرادینے کا ذمہ لیا اور جے سنگھ سے مل کر اُسے صلح پر راضی کر لیا۔ صلح کے بدلے میں اجیت سنگھ نے اپنی بیٹی جے سنگھ سے بیاہ دی اور شاہی خزانے سے ۲۰ لاکھ روپیہ بطور جہیز دیا گیا۔ اور صوبہ سورت کی حکومت بطور انعام جے سنگھ دی گئی۔ اجیت سنگھ اجمیر اور گجرات کا صوبہ دار تھا۔ اور اب اس کے داماد جے سنگھ کو سورت کی حکومت دے کر دونوں سیدوں نے مغل سلطنت کا بہت بڑا علاقہ راجپوت سرداروں کے حوالے کر دیا جو دارالسلطنت دہلی کے جنوب میں ۶۰ میل کے فاصلے سے شروع ہو کر ساحل سمندر تک پھیلا ہوا تھا[۲۶] یوں مغل بادشاہوں کی نااہلی بے بسی اور لاپروائی کے سبب مغل سلطنت کے حصے بخرے ہو رہے تھے۔

سید برادران کو بادشاہ کی ذات پر مکمل تسلط حاصل تھا۔ انھوں نے محمد شاہ کو ایک قیدی کی طرح رکھ چھوڑا تھا۔ بادشاہ کے گرد وپیش ہر خدمت پر سیدوں کے آدمی مقرر تھے۔ ہمت خان بارہیہ اتالیق کی حیثیت سے سایہ کی طرح ساتھ لگا رہتا تھا۔ بادشاہ اس کی اجازت کے بغیر نہ کہیں جاسکتا تھا اور نہ کسی سے بات کر سکتا تھا۔ بادشاہ اور سارا خاندان ان جکڑ بندیوں سے سخت پریشانی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ دونوں بھائیوں کے اس طرز عمل سے شاہی خاندان ہی نہیں امراء سلطنت بھی نالاں تھے۔ سیدوں نے اور ان کی دست راست رتن چند نے تمام ملکی اور مالی انتظامی عہدے سادات بارہہ اور رتن چند کے لوگوں کے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ اس سے ملک کے اہل سیف اور اہل قلم شرفا میں بے کاری اور بے چینی پھیل رہی تھی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر تورانی امراء کے لیڈر نظام الملک صوبہ دار دکن، ان کے نسبتی بھائی عبدالصمد خان صوبہ دار لاہور اور ایرانی جماعت کے سربراہوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ سید برادران کے اقتدار کو ختم کر دیا جائے۔ سیدوں کو اس مشترکہ جوڑ توڑ کی خبر ہوگئی۔ تو انھوں نے سب سے پہلے نظام الملک کے خلاف فوجی کاروائی کی۔ نظام الملک نے سیدوں کی طرف سے بھیجی گئی فوج کو شکست دی اور اس کے سپہ لار کو قتل کر دیا۔ اس ناکامی سے بوکھلا کر حسین علی محمد شاہ کو لیکر نظام الملک کی سرکوبی کے لئے خود روانہ ہوا۔ محمد شاہ

کے دربار میں اس وقت تورانی جماعت کا ایک طاقت ور لیڈر محمد امین خان موجود تھا۔ وہ نظام الملک کا قریبی رشتہ دار تھا۔ وہ بہ ظاہر سیدوں سے ملا ہوا تھا مگر بباطن ان کا سخت دشمن تھا۔ سید برادران یہ بات جانتے تھے اور اسے دہلی میں اکیلا چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اُسے بھی فوج میں شامل کر لیا گیا۔ راستے میں محمد امین خان نے حسین علی کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اور فوج کے دکن پہنچنے سے پہلے ہی حسین علی قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۲۰ء کا ہے سید عبداللہ کو جب اپنے بھائی کے قتل کی اطلاع ملی تو طیش میں آ کر اس نے محمد شاہ کی فوج پر حملہ کر دیا۔ لڑائی میں اُسے شکست ہوئی اور پابہ زنجیر کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ دو سال بعد زہر دے کر اُسے جیل خانے ہی میں ہلاک کر دیا گیا۔ یوں فرخ سیر کی معزولی کے دو سال کے اندر بادشاہ گر سید برادران کا خاتمہ ہو گیا۔

سید برادران کے خاتمے سے بادشاہِ وقت محمد شاہ نے آزادی کی سانس ضرور لی۔ لیکن ان کے ۸ سالہ دور اقتدار میں سلطنت مغلیہ کو جو عظیم نقصان پہنچا اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ تھی۔ سادات بارہہ کا عروج فرخ سیر کے غلط انتخاب کا نتیجہ ہے۔ فرخ سیر نے سید عبداللہ کو اپنا وزیر اعظم اور سید حسین علی کو میر بخشی کے عہدے دیئے تھے۔ حالانکہ اورنگ زیب نے اپنے وصیت نامے میں سادات بارہیہ اور ان کے عزائم کے بارے میں اپنے جانشینوں کو خبردار کر دیا تھا۔ اُس وصیت نامے میں سادات بارہیہ کے تعلق سے جو تحریر ملتی ہے وہ اورنگ زیب کی مردم شناسی کی صلاحیت کا بہترین نمونہ ہے۔ "بارہیہ کے سید دعاؤں اور نیک خواہشات کو پیش کرنے والے ہیں.......... تم ان کے احترام کرنے میں کبھی کسر نہ کرنا اس سے تمہیں دنیا اور آخرت دونوں جہان میں فائدہ ہو گا لیکن بارہیہ کے سیدوں سے معاملات میں بہت چوکنا رہنا چاہیئے۔ دل و جان سے انھیں چاہنا لیکن بارہیہ کے عہدوں کو بڑھانا بھی مت ورنہ وہ حکومت میں انتہائی بااثر شریک بن جائیں گے صرف یہی نہیں وہ اپنے لئے حکومت ہی کی مانگ کرنے لگیں گے۔ اگر حکومت کی تھوڑی بہت لگام تم انھیں ہاتھ میں لے لینے دو گے تو انجام کار تمہیں بے عزت ہونا پڑے گا۔" [۲۷]

نوعمر محمد شاہ سید برادران سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد انتظام سلطنت اپنے

وزیر قمر الدین خان کے حوالے کر کے خود داد عیش دینے میں مصروف ہو گیا۔ بادشاہ کی اس غفلت اور لاپروائی سے ان امراء کی مراد بر آئی جو اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو چکے تھے۔ چنانچہ بہت سے صوبے عملاً آزاد ہو گئے۔ بہار، بنگال اور اُڑیسہ میں مرشد قلی خان کی اور اودھ میں سعادت خان کی دہلی سے وفاداری بس برائے نام رہ گئی۔ کابل اور لاہور کے صوبہ دار عملاً آزاد ہو گئے۔ مرہٹوں نے گجرات، مالوہ اور بندیلکھنڈ کا ایک حصہ قبضہ میں کر لیا۔ دوآبہ میں روہیلے خود مختار ریاستیں قائم کرنے لگے۔ اور محمد شاہ اس انتشار کو محض تماشائی بنا "غرق مے ناب" کرتا رہا۔ تقریباً تیس سال کے عرصے میں عظیم مغلیہ سلطنت بکھر گئی اور زوال کی آخری حدوں کو چھونے لگی۔ اسی لئے محمد شاہ رنگیلے کو خاتم السلاطین بابر یہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس انتشار کا لازمی نتیجہ جو برآمد ہوا یہ تھا کہ معاشرہ اندر سے کمزور اور اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب بیرونی حملہ آوروں کے لئے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ اس صورت حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ امراء کی خود غرض اور سازشی ذہن کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آصف جاہ نظام الملک نے نادر شاہ سے معاہدہ کر کے یہ طے کر لیا کہ نادر شاہ محمد شاہ کی بادشاہت کو بحال رکھے گا اور دو کروڑ زر تاوان لیکر واپس چلا جائیگا۔ تو برہان الملک سعادت خان نے یہ سوچ کر کے اس معاہدے سے نظام الملک آصف جاہ کا درجہ بہت بڑھ جائے گا، نادر شاہ کو ترغیب دی کہ وہ دہلی چلے جہاں اس کو اتنی دولت ملے گی کہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہو گا۔ اگر برہان الملک سعادت خان یہ غداری نہ کرتا اور نادر شاہ کو دہلی آنے کی ترغیب نہ دیتا تو دہلی کی تباہی و بربادی کا وہ سانحہ پیش نہ آتا جس نے سلطنت مغلیہ کی کمر توڑ دی۔ اس سانحہ میں ایک اندازے کے مطابق تیس ہزار سے لیکر ڈیڑھ لاکھ مرد، عورت ہندو مسلمان تہ تیغ ہوئے۔[۲۸]

۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے انتقال کے بعد احمد شاہ اس کے وارث کی حیثیت سے پرامن طریقہ پر تخت نشین ہوا۔ نیا بادشاہ ایک نیک فطرت شخص تھا لیکن اس کو کاروبار جہاں بانی کی کوئی تربیت نہیں ملی تھی۔ پیدائش سے لیکر ۲۱ سال کی عمر تک اس کی

پرورش حرم کی عورتوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ چنانچہ ملکی انتظام کی باگ ڈور منہ چڑھے مصاحبوں، دوستوں، خواجہ سراؤں اور حرم کی عورتوں کی سربراہ مادر ملکہ ادھم بائی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ادھم بائی شاہی حرم میں داخل ہونے سے پہلے ایک ناچنے والی طوائف تھی۔ چنانچہ ملکی انتظامیہ پر قبضہ کرنے کی خاطر تورانی امراء اور ایرانی امراء کے درمیان خانہ جنگی کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھر مرہٹے، سکھ، روہیلے اور جاٹ اپنی شورشوں سے سلطنت کے درو دیوار ہلاتے رہے۔ آخر ش ۱۷۵۴ء میں عمادالملک اور ہولکر نے مل کر احمد شاہ کو معزول کر دیا۔ جہاں دار شاہ کے بیٹے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بیٹھایا گیا۔

۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر انگریزوں نے بنگال میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ ۱۷۵۹ء میں عمادالملک نے عالمگیر ثانی کو قتل کروا کر اس کی لاش دریائے جمنا میں پھکوادی اور کام بخش کے پوتے محی لملک کو شاہ جہاں ثالث کے لقب سے تخت نشین کروایا۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد شاہ عالم ثانی کو بادشاہ ہند تسلیم کر لیا۔ شاہ عالم ثانی اس وقت دہلی سے دور اپنے مقدر سے لڑ رہا تھا۔ ۱۷۶۴ء میں شجاع الدولہ نے شاہ عالم ثانی کے ساتھ مل کر انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں جو جنگ بکسر کے نام مشہور ہے انگریزوں نے شاہی افواج کو شکست دے کر شاہ عالم ثانی کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند اس سے حاصل کر لی۔ کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے پچاس لاکھ روپیہ کے بدلے اودھ کا علاقہ شجاع الدولہ کے سپرد کر دیا۔ ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلہ سردار حافظ رحمت خان کو شکست دی۔ حافظ رحمت خان میدان جنگ میں مارے گئے اور اس کے ساتھ روہیلوں کا زور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔

جنگ بکسر کے بعد مغل شہنشاہ شاہ عالم انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا تھا۔ انگریزوں نے اُسے الٰہ آباد میں نظر بندی کی حالت میں چھوڑ رکھا تھا۔ اس محبوس فضا سے نکل کر دہلی کی آزاد فضا میں سانس لینے کی تمنا میں اس کے دن کٹ رہے تھے۔ مرہٹے بادشاہ کی اس لاچاری سے فائدہ اُٹھانے کے لئے حرکت میں آئے اور اُسے الٰہ آباد سے نکال کر دہلی لے

آ ئے۔ یوں ۱۲ سال کی جلاوطنی کے بعد شاہ عالم اپنے دارالسلطنت واپس آئے۔ مرہٹے اب اس موقف میں تھے کہ مغل سلطنت کے معاملات میں اپنا اقتدار استعمال کریں۔ لیکن ۱۷۷۲ء میں چوتھے پیشوا مادھوراؤ کا انتقال ہو گیا اور مرہٹے جانشینی کی خون ریز جنگ میں مبتلا ہو گئے اور دہلی کے معاملات کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہ ملی اُس دوران نجف خان جسے احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی جنگ (۱۷۶۱ء) سے فارغ ہونے کے بعد بچی کھچی مغلیہ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ مملکت کے باقی ماندہ علاقوں کو دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھے رہا۔ ۱۷۸۲ء میں نجف خان کا انتقال ہو گیا اور اس کے نائب نجف خان کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے۔ ان حالات سے پریشاں ہو کر شاہ عالم نے وسط ہند کے مرہٹہ سردار مادھوجی سندھیا کو دعوت دی کہ دہلی آ کر نظم و نسق سنبھال لے۔ سندھیا نے بادشاہ کی دعوت قبول کر لی اور فتح پور سیکری کے پاس ان کے پڑاؤ میں حاضر ہوا، ۱۰۱ اشرفی بطور نذرانہ پیش کئے اور اپنا سر بادشاہ کے قدموں پر رکھ دیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر حسب وعدہ مادھوجی سندھیا کو وکیل مطلق کا عہدہ عطا کیا جس میں وزیر اعظم اور میر بخشی (سپہ سالار اعظم) دونوں عہدے شامل تھے۔ مادھوجی سندھیا سارے مرہٹہ سرداروں میں سب سے مدبر، نامور اور طاقتور سردار تھا۔ اگر وہ چاہتا تو دہلی کے تخت پر بہ آسانی قبضہ کر سکتا تھا۔ مادھوجی سندھیا کے اس رویہ سے یہ حقیقت کھل کر واضح ہوتی ہے مرہٹوں نے مغل اقتدار کو ختم کر کے مرکز میں اپنی حکومت کے قیام کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ شاید شاہ عالم نے بھی سندھیا کے رویے سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہو۔ چنانچہ سندھیا نے جس فدویانہ عقیدت کا اظہار کیا تھا اس سے خوش ہو کر شاہ عالم نے ایک فارسی قصیدے میں مادھوجی کو "فرزند جگر بند" کے محبت بھرے الفاظ سے نوازا ہے [29]

مادھوجی سندھیا فرزند جگر بنداست

ہست مصروفِ تلافی ستم گاری ما

مادھوجی سندھیا نے مغل انتظامیہ کا سب سے اونچا عہدہ حاصل کر لیا۔ لیکن مغل سلطنت کا فلک بوس قصر نہایت تیزی سے زمین بوس ہو رہا تھا۔ اس کی تعمیر نو کے لیے بن

وسائل اور وقت کی ضرورت تھی وہ سندھیا کو بدقسمتی سے نصیب نہ ہوئے۔ خاص طور پر مرہٹہ سرداروں کی باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے سندھیا دہلی میں مستقل قیام نہیں کر سکا۔ مغل امراء نے غلام قادر روہیلے کی سرکردگی میں مادھوجی سندھیا کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ غلام قادر روہیلے نے قلعے میں گھس کر شاہی محل کو لوٹ لیا، حرم سرا کی خواتین کو ذلیل کیا اور شاہ عالم کو معزول کر کے اسے سخت اذیتیں دے کر آنکھیں نکال لیں۔ مادھوجی سندھیا کو جب اس ظلم وستم کی اطلاع ملی تو غیظ وغضب کے عالم میں دہلی پہنچا، غلام قادر روہیلے کو قتل کر کے اس کا سر بادشاہ کے قدموں میں ڈال دیا اور اندھے بادشاہ کو پھر سے تخت پر بیٹھا دیا۔

انگریز دہلی سے دور بیٹھے دہلی کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ بنگال، بہار اور اُڑیسہ ان کے قبضہ میں تھے۔ اودھ میں انکا باج گزار نام نہاد حکمران تھا۔ روہیل کھنڈ کے اہل سیف پٹھانوں کا سر انھوں نے کچل دیا تھا۔ کئی خون ریز معرکوں کے بعد میسور کی چوتھی جنگ (۱۷۹۹ء) میں میر صادق کی غداری سے فائدہ اٹھا کر اپنے سب سے زبردست اور نا قابل تسخیر حریف ٹیپو سلطان شہید کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں نظام حیدر آباد نے اپنی آزادی کا سودا کر کے سارے دکن میں انگریز راج کی جڑوں کو مضبوط کر دیا تھا۔ اب رہ گئے مرہٹے، وہ راجپوتانے اور پنجاب کو روند کر وسط ہند میں اپنے ہی ہم قوم بھائی بندوں کا سر قلم کرتے ہوئے دندناتے پھر رہے تھے۔ اور دہلی میں اندھا مغل تاج دار بے یار ومددگار مرہٹوں کے رحم وکرم پر زندہ تھا۔

انگریزوں نے جان لیا کہ مرہٹوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانے کا وقت آپہنچا ہے۔ ۱۸۰۲ء میں یشونت راؤ ہولکر نے پیشوا کو شکست دے کر پونا سے باہر دھکیل دیا۔ اب پیشوا کے لئے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس نے انگریزوں کی سرپرستی قبول کر لی اور صلح نامے پر دستخط کر کے مرہٹہ اقتدار سے دست بردار ہو گیا۔ یوں مرہٹوں کی مرکزی حکومت کا وجود ختم ہو گیا۔ اس کے بعد آرتھر ویلزلی نے دکن میں سندھیا اور بھونسلہ کی فوجوں کو الگ الگ میدانوں میں شکست دے دی۔ پھر دونوں نے اپنے اپنے علاقے انگریزوں کے حوالے کر کے آزادی سے دست برداری کے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ اب انگریزوں کے لئے

دہلی کا راستہ صاف تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں جنرل لیک کی سرکردگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجیں علی گڑھ اور آگرہ پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی میں داخل ہوئیں تو اندھا بادشاہ شاہ عالم بے بسی کے عالم میں ایک پھٹے ہوئے شامیانے کے نیچے انگریزوں کے استقبال کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ جنرل لیک نے مغل شہنشاہ کو اپنی حفاظت میں لیکر اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور پھر برعظیم کا اقتدار اعلیٰ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ لیکن کمپنی نے کبھی اقتدار اعلیٰ کا دعویٰ نہیں کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک سارے ملک میں یہ نعرہ گونجتا رہا۔

خلقت خدا کی، ملک شہنشاہ کا اور حکومت کمپنی بہادر کی۔۳۰

اس نعرہ کے پیچھے یہ فلسفہ کام کر رہا تھا کہ ہندوستان ایک نادیدہ غیر مری وجود (الکھ پرش) کو حاکم اعلیٰ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شاہی نظام حکومت میں مقتدر اعلیٰ ایک گوشت پوست کی مرئی ذات ہوا کرتی تھی۔ اور حکومت سے وفاداری کا تصور اس ذات سے وابستہ تھا۔ اٹھارویں صدی میں ہندوستان برطانیہ کے زیر اقتدار آیا۔ اور پہلی بار ایک پردیسی ملک کی تجارتی کمپنی نے جس کا وطن ہندوستان سے کئی ہزار میل دور تھا ہندوستان کی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ ملک پر اس طرح کا قبضہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے تقریباً ۲۵۰ سال تک ایک مرکزی سیاسی وحدت کے زیر سایہ ہندوستانیوں نے ایسی حکومت کی تشکیل کی تھی جو اپنی شان و شوکت، چمک دمک، اپنی دولت اور تہذیب و کلچر میں بے مثال تھی۔ اس حکومت کا نظام ایسا تھا جو سارے ملک کے لئے امن و قانون کا ضمانت دار اور علم و فن کی ترقی کے نادر مواقع فراہم کرتا تھا۔ اس عظیم الشان حکومت کی جانشینی گو کہ کمپنی کے لئے باعث افتخار تھی۔ لیکن کمپنی کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہندوستانی پچھلی حکومت کے معماروں کے سر پر سجے اقتدار اعلیٰ کے تاج کو کمپنی کے سر پر رکھنے پر راضی ہو جائیں گے۔ کیونکہ نیا حکمران گوشت اور خون کا کوئی فرد نہیں تھا۔ وہ ایک خیالی شخصیت تھی اور اس کے ایجنٹ جو بار بار بدلتے رہتے تھے حکومت کا دعویٰ کر رہے تھے۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لئے ہندوستانیوں نے ایجنٹوں کے اس جھنڈ کو ایک شخصیت کا روپ دیا اور اس کا نام 'کمپنی بہادر' رکھ دیا۔۳۱ کمپنی بہادر اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے شاطرانہ چالوں سے اور سیاسی

انارکی سے فائدہ اٹھا کر مغلوں کے حاکمانہ اختیارات کو غصب کرلیا ہے۔ اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی تو ہندوستانیوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ وہ مغلوں کے زیر سایہ ملکی انتظام کی ذمہ داری سنبھال رہی ہے۔ یوں مغل شہنشاہ کو لال قلعہ کے اندر محدود کر کے حکومت کرنے کا جواز پیدا کرلیا۔

دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد ملکی انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھ میں چلا گیا اور مغل اقتدار ایک علامت کے طور پر باقی رہ گیا۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہو گیا۔ شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد بہادر شاہ جو تاریخ میں بہادر شاہ ظفر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ مغل سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران مجاہدین نے سارے ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کر کے جنگ آزادی کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی۔ اگست ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کرلیا۔ اور بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرلیا۔ بغاوت کے جرم میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ۹ / مارچ ۱۸۵۸ء کو اس جرم میں جلاوطن کر کے رنگون میں قید کر دیا گیا جہاں ۷/ نومبر ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح ۹ / مارچ ۱۸۵۸ء کو مغل سلطنت کا ۳۳۲ سال بعد خاتمہ ہو گیا۔

حوالہ جات

۱۔ تاریخ ادب اُردو جلد دوم حصہ اول: ڈاکٹر جمیل جالبی صفحہ ۱۔ مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور طبع اول جون ۱۹۸۲ء

۲۔ تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول: ڈاکٹر تاراچند (مترجم: قاضی محمد عدیل عباسی) صفحہ ۴۷ مطبوعہ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی طبع اول ۱۹۸۰ء

۳۔ ایضاً صفحہ ۷۵

۴۔ اورنگ زیب۔ ایک نیا زاویہ نظر: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد (مترجم فیضان رشید) صفحہ ۴ مطبوعہ خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ طبع اول ۱۹۹۰ء

۵۔ ایضاً صفحہ ۵

۶۔ ایضاً صفحہ ۵

۷۔ ایضاً صفحہ ۵

۸۔ ایضاً صفحہ ۶

۹۔ ایضاً صفحہ ۶

۱۰۔ اورنگ زیب اور ہندوؤں کے ساتھ اس کے تعلقات: ڈاکٹر اکھیلیش جائسوال: صفحہ ۸۹

۱۱۔ اورنگ زیب۔ ایک نیا زاویہ نظر: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد (مترجم۔ فیضان رشید) صفحہ ۶ مطبوعہ: خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ طبع اول ۱۹۹۰ء

۱۲۔ تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ ترقی اُردو بیورو نئی دہلی: طبع اول ۱۹۸۰ء

۱۳۔ ایضاً صفحہ ۲۳۵

۱۴۔ ایضاً صفحہ ۲۱۷

۱۵۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم: ثروت صولت: صفحہ ۲۸۷: مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لاہور طبع سوم مئی ۱۹۸۴ء

۱۶۔ دکن کی سیاسی تاریخ: سید ابوالاعلیٰ مودودی: صفحہ ۳۲۳: مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور: طبع سوم جون ۱۹۶۹ء

۱۷۔ ایضاً ۳۱

۱۸۔ تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ ترقی اُردو بیورو نئی دہلی: طبع اول ۱۹۸۰ء

۱۹۔ ایضاً صفحہ ۲۰۶

۲۰۔ اورنگ زیب۔ ایک نیا زاویہ نظر: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد (مترجم: فیضان رشید) صفحہ ۲۹ مطبوعہ خدا بخش اورنیٹل پبلک لائبریری پٹنہ طبع اول ۱۹۹۰ء

۲۱۔ ایضاً صفحہ ۳۱

۲۲۔ ایضاً صفحہ ۲۸

۲۳۔ تاریخ ادب اُردو جلد دوم حصہ اول: ڈاکٹر جمیل جالبی۔ صفحہ ۲ مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول جون ۱۹۸۲ء

۲۴۔ تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول، ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) صفحہ ۷۹ مطبوعہ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی۔ طبع اول ۱۹۸۰ء

۲۵۔ دکن کی سیاسی تاریخ: سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۱۳۰، مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور: طبع سوم جون ۱۹۶۹ء

۲۶۔ ایضاً صفحہ ۱۴۰

۲۷۔ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد (مترجم فیضان رشید) صفحہ ۵۹، مطبوعہ خدا بخش اورنیٹل پبلک لائبریری، پٹنہ طبع اول ۱۹۹۰ء

۲۸۔ تاریخ ادب اُردو جلد دوم حصہ اول: ڈاکٹر جمیل جالبی، صفحہ ۴ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول جون ۱۹۸۲ء

۲۹۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء خورشید مصطفےٰ رضوی صفحہ ۷۴ مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی طبع اول

اپریل ۱۹۵۹ء (ناشر مکتبہ بُرہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶)

۳۰۔ آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی: غلام حیدر: صفحہ ۲۸، مطبوعہ اُردو اکادمی دہلی مارچ ۱۹۸۶ء

۳۱۔ تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) صفحہ ۳۶۰ مطبوعہ ترقی اُردو بیورو نئی دہلی۔ طبع اول ۱۹۸۰ء

۱۔ نوٹ: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد صاحب نے اپنی کتاب کے صفحات ۶۱ تا ۶۸ پر اصل ماخذ کے حوالے دے ہیں چونکہ ہماری رسائی اصل ماخذ تک نہیں ہو پائی لہذا ان کتابوں کو حوالہ جات میں درج کرنے سے ہم نے گریز کیا ہے۔ اصل ماخذ کا جاننا بہ غرض تحقیق ضروری ہو تو ڈاکٹر پرساد کی کتاب سے رجوع کیا جائے البتہ محمد اطہر علی (حوالہ نمبر ۷) کی کتاب ''اورنگ زیب کے عہد کے مغل امراء سے ہم نے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اطہر علی کی یہ کتاب ان کے پی ایچ ڈی کے مقالہ پر مبنی ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ۱۹۶۱ء میں پیش کیا گیا تھا۔ بعدازاں یہ مقالہ ترقی اُردو بیورو نئی دہلی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر اکھیلیش جائسوال صاحب کی کتاب ''اُورنگ زیب اور ہندوؤں کے ساتھ تعلقات'' ہمیں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار صاحب نے فراہم کی ہے۔ اس کتاب کا سرورق غائب ہے اس لئے ہم اس کے ناشر کا نام اور تاریخ اشاعت نہیں دے سکے یہ کتاب چونکہ ڈاکٹر ریتا جوشی پروفیسر شعبہ تاریخ عہد وسطیٰ الہ آباد یونیورسٹی کے دیباچہ کے ساتھ چھپی ہے۔ اس لئے اغلب ہے کہ یہ ڈاکٹر جائسوال صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہوگا جو الہ آباد یونیورسٹی کو پیش کیا گیا ہو۔

باب دوم

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

اس باب کا آغاز ایک انگریز مورخ ایڈورڈ تھامپسن کے ایک اقتباس سے کیا جاتا ہے۔جنگِ آزادی جسے کمپنی نے غدر کا نام دیا تھا کے بارے میں تھامپسن صاحب لکھتے ہیں:

''آج سے ایک سو سال بعد یقیناً ایک دن ایسا آئے گا جب غدر کے متعلق تمام واقعات اور ہندوستانی روایات کا سختی سے احتساب کیا جائے گا اور اس پر تعصب یا پروپیگنڈے کی حیثیت سے نہیں بلکہ خالص تاریخی اعتبار سے نظر ڈالی جائے گی جس کے بعد وہ ایک مستند صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یقیناً غلامانہ زندگی کی یہ ایک نہایت ہی خوفناک کہانی ہوگی۔[۱]

یہ اقتباس جناب خورشید مصطفےٰ رضوی صاحب کی کتاب ''جنگِ آزادی اٹھارہ سو ستاون'' سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۷ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر تاراچند صاحب فرماتے ہیں:

''شاید اس مضمون پر یہ اردو کی پہلی تصنیف ہے جس میں بلا تعصب مذہب و ملت اس انقلاب کی صحیح کہانی بتلائی گئی ہے''[۲]

اور ڈاکٹر کے ایم اشرف صاحب فرماتے ہیں۔

''ہندوستان میں ہماری تصنیفوں کے ماخذ آج بھی انگریزوں کی مرتب کردہ یادداشتیں اور تاریخیں ہیں۔ بلکہ ہمارا نقطہ نظر بھی برطانیہ نواز ہے اور ہمارے ممتاز مورخین یہ کہنے میں پس و پیش کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک ہماری جنگ آزادی کا پہلا اعلان تھا۔ مسٹر سین اور ماجومدار جیسے چوٹی کے مورخین نے یہ بھی لکھا کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں وہابی علماء نے شرکت نہیں کی۔ حالانکہ خود سرکاری بیانات سے اس کا جگہ جگہ اظہار ہوتا ہے۔ میں مختصراً یہ عرض کرنے

میں حق بہ جانب ہوں کہ مسٹر ساورکار کے بعد تا حال کسی ہندوستانی مورخ کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس جدوجہد آزادی کی مفصل اور مسلسل تاریخ ہندوستانی نقطہ نظر سے اور ہندوستانی ماخذ کی مدد سے مرتب کرتا۔ اب البتہ اس فریضے کی طرف توجہ ہوئی ہے اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ عزیزی خورشید نے اردو زبان میں یہ کتاب لکھ کر اس کی ابتدا کی ہے۔''[۳]

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسٹر تھامپسن کی پیشن گوئی کے مطابق مکمل ایک سو سال بعد خورشید مصطفےٰ رضوی صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا خالص تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ونایک دامودھر ساورکر نے ۱۹۰۹ء میں انگریز مورخوں کے دیئے ہوئے نام ''غدر'' (فوجی بغاوت) کو چیلنج کیا تھا۔ اور ہندوستان کے تین چوتھائی علاقے پر لڑی جانے والی جنگ کو پہلی جنگ آزادی ثابت کیا تھا۔ لیکن ساورکر کا مضمون بہت مختصر اور جنگ آزادی کے صرف ایک پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔[۴] اسکے برعکس خورشید صاحب کی کتاب جنگ آزادی کا مکمل نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس لئے اس مضمون میں بیان کردہ بیشتر تفصیلات کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ مضمون میں جنگ آزادی کے تین مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے گا۔ ۱۔ پس منظر، ۲۔ عسکری جدوجہد کی تفصیلات، ۳۔ ناکامی اور اس کے اسباب۔

پسِ منظر:

۱۸۰۳ء میں جنرل لیک (Lake) کی سرکردگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجیں دہلی میں داخل ہوئیں اور شاہ عالم ثانی کو اپنی حفاظت میں لے کر اسکا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ برعظیم کا اقتدار عملاً انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم ثانی کا انتقال ہو گیا۔ شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی کو تخت سلطنت پر بیٹھایا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کے انتقال پر نام نہاد مغل اقتدار بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ آیا۔ ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی برائے نام مغل شہنشاہ کے بظاہر نمائندے کے طور پر خود مختار حکومت کرتی رہی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے دوران مجاہدین نے بہادر شاہ ظفر کو سارے

ہندوستان کا مقتدر شہنشاہ تسلیم کرلیا۔ اگر چہ بہادر شاہ ظفر کے اقتدار اعلیٰ کا یہ دور بہت مختصر رہا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین نے برائے نام بادشاہت کے زمرہ سے نکال کر اقتدار اعلیٰ کا تاج انکے سر پر سجا کر پھر سے حاکم با اختیار بنا دیا۔ یوں بہادر شاہ ظفر مغل خاندان کے آخری شہنشاہ قرار پائے۔

عظیم الشان مغلیہ سلطنت کے زوال سے جو سیاسی خلا پیدا ہوا اسے پر کرنے کی کسی بھی مقامی حکمران نے کوشش نہیں کی۔ ۱۷۵۷ء میں کلایو نے میر جعفر، ولبھ رام، یار لطف خان اور جگت سیٹھ کی غداری کے بل بوتے پر نواب سراج الدولہ کو جنگِ پلاسی میں شکست دے کر ہندوستان میں انگریزی سامراج کا راستہ ہموار کر دیا۔ یہ جنگ ۲۳/جون ۱۷۵۷ء کو بھاگیرتی ندی کے کنارے پلاسی کے مقام پر لڑی گئی۔ یہ تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے غیور فرزندوں نے اسے اپنی اجتماعی شکست قرار دیا تھا جس کی یاد وہ ہر سال پلاسی کے میدان میں جمع ہو کر مناتے رہے۔ اور پورے ایک سو سال بعد ۱۸۵۷ء میں اس اعلان کے ساتھ میدان میں آئے کہ ـــ "آج ہم پلاسی کا بدلہ لیں گے۔"

جنگِ پلاسی کے بعد جو فیصلہ کن جنگ ہوئی وہ ۱۷۹۹ء میں سطح مرتفع دکن کے جنوب مغرب میں دریائے کاویری کے کنارے سرنگا پٹم کے قلعہ میں لڑی گئی۔ تاریخ نے ایک بار جنگ پلاسی کا منحوس ڈرامہ میسور میں دہرایا۔ میر صادق، میر قمر الدین اور میر معین الدین کی غداری کے بل بوتے کمپنی کی فوجیں سرنگا پٹم کے قلعہ کی دیواروں کو منہدم کر کے قلعہ میں داخل ہو گئیں۔ اور ۴/مئی ۱۷۹۹ء کو جنگ پلاسی کے پورے چالیس سال بعد ٹیپو سلطان نے جامِ شہادت نوش کیا۔ سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کا چراغ گل ہو گیا۔ اس موقعہ پر مرد مجاہد سبھاش چندر بوس کا ایک قول کتنا برمحل ہے ملاحظہ ہو۔ "افراد کی قربانی اور موت سے قومیں زندہ ہوتی ہیں۔ اگر میں کل اپنے ملک کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں تو مجھے آج اس کے لئے مرجانا ہوگا تا کہ میرا وطن آزادی اور عظمت سے ہم کنار ہو سکے۔" چنانچہ ٹیپو سلطان نے ہند کی سرزمین کو اپنے خون سے سرخ رو کر کے آزادی کے جذبے کو زندہ رکھا۔

ٹیپو سلطان کے بعد مرہٹے ایک قوت رہ گئے تھے جو انگریزوں کی ہوس ملک گیری پر

بند باندھ سکتے تھے۔ اور تاریخ میں ایک ایسا موڑ آیا تھا جب مادھو جی سندھیا نے شاہ عالم کو الہٰ آباد سے انگریزوں کی پناہ سے نکال کر دہلی لے آئے اور تخت سلطنت پر بیٹھا کر انکے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ شاہ عالم نے اس خدمت اور انکے جذبے کی قدر کرتے ہوئے اپنا منہ بولا بیٹا تسلیم کر کے سندھیا کو وکیل مطلق کا عہدہ عطا کیا تھا جس میں وزیر اعظم اور سپہ سالارِ اعظم دونوں شامل تھے۔ لیکن مرہٹہ سرداروں کی آپس میں خانہ جنگی کی وجہ سے سندھیا کو اتنا وقت ہی نہ مل سکا کہ وہ دہلی میں مستقل قیام کر کے مغل سلطنت کے الجھے ہوئے معاملات کو ٹھیک کر کے اسے ایک نا قابل تسخیر قوت میں بدل دیتے۔ چنانچہ مرہٹے سردار باہمی جنگ وجدل میں الجھے رہے۔ اور کمپنی بہادر بنگال سے لیکر دکن تک اپنے اقتدار کو مستحکم کرتی رہی۔ نظام حیدر آباد (نظام علی خان) نے ۱۸۰۰ء میں انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ، جسے عہد معاونت (Subsidiary Alliance) کہتے ہیں کر کے اپنی حکومت بچالی لیکن دولت آصفیہ حیدر آباد کی آزادی کا سودا کر لیا۔ ۵

اب انگریزوں کے لئے دلّی کے راستے میں کوئی بڑی طاقت حائل نہیں تھی۔ مرہٹہ قوت کمزور ہو چکی تھی۔ چنانچہ جنرل لیک نے دلّی میں داخل ہونے سے پہلے علی گڑھ کے مقام پر سندھیا کی فوجوں کو تہس نہس کر دیا۔ اسکے بعد آرتھر ویلزلی نے جو بعد میں ڈیوک آف ونگٹن ہوا سندھیا اور بھونسلے کی فوجوں کو باترتیب آئے اور آرگاوں کے مقامات پر بری طرح شکست دے دی۔ اس شکست کے بعد سندھیا اور بھونسلے نے اپنی آزادی سے دست برداری کے معاہدے پر دستخط کر کے اقتدار انگریزوں کے حوالے کر کے وظیفہ پر قناعت کر لی۔ اس طرح مرہٹوں کا ہندو پدشاہی کا خواب معدوم ہو گیا۔ ٦

میسور کی آزادی ختم کرنے کے بعد اور مرہٹہ قوت کو پوری طرح برباد کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۵۰ سال کے اندر یعنی ۱۸۵۰ء تک ہندوستان کی علاقائی ریاستوں کے علاوہ لگ بھگ پچیس ہزار جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کی املاک کو ضبط کر کے انگریزی راج میں شامل کر لیا۔ جس جس علاقے کا الحاق انگریز کرتے گئے وہاں کی بے اندازہ دولت لوٹ لی گئی، شہر ویران ہو گئے، زراعت، صنعت اور تجارت تباہ ہو گئی۔ صنعت اور تجارت کی بربادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ روٹی روزگار کے لئے زراعت کی طرف متوجہ

ہوتے گئے لیکن انگریزوں نے پہلے سے بڑے بڑے زمینداروں کو زمینات سے بے دخل کر کے ان پر چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو مقرر کر دیا تھا اور ان پر براہ راست زبردست محصول عاید کر دیا تھا۔ چھوٹے کاشتکاروں سے جو لوٹ حاصل کی گئی تھی اُسے زرعی ترقی اور کسانوں کی امداد میں لگانے کے بجائے ہندوستان میں لڑی گئی جنگوں کے مصارف اور برطانیہ کی صنعتی ترقی میں جھونک دی گئی۔ اس طرح ہندوستانی زراعت کو ترقی کرنے اور ملکی ضروریات کے مطابق آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۴۸ء تک کمپنی بہادر نے ہندوستان میں ۲۰ عظیم جنگیں لڑی تھیں جس کا سارا خرچ ہندوستان کی زمینات کے محصول سے ادا کیا گیا۔ ے اس کے علاوہ جو دولت ہندوستان کے رجواڑوں اور نوابوں سے زبردستی چھین لی گئی تھی وہ راست کمپنی کے انگریز ملازمین خصوصاً فوجی سربراہوں کی جیب میں چلی گئی۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو مجبور کر کے زرخیز زمینات پر زندگی کے بنیادی ضروریات کے اناج جیسے چاول، جوار، مکئی، گیہوں اور دالیں وغیرہ اگانے کے بجائے کیش کراپ جیسے پٹ سن، کاٹن، مرچ، دھنیاں اور افیون (opium) وغیرہ اگانے کا رواج ڈالا۔ اس لوٹ گھوسٹ اور غلط پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی ہند ۱۸۳۷ء میں ہولناک قحط کا شکار ہو گیا۔ اس قحط کے دوران ایک اندازے کے مطابق بنگال اور بہار میں کم از کم آٹھ لاکھ انسان موت کا نوالہ بن گئے۔ ۸

۱۸۳۰ء میں کمپنی نے اعلان کیا کہ سرکاری دفاتر میں انگریزی زبان رائج کی جائے گی۔ اس وقت تک مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے برادرانِ وطن خاص طور پر ہندو طبقہ تیزی سے انگریزی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کلکتہ میں پہلا انگریزی کالج ۱۸۱۶ء میں اینگلو انڈین کالج کے نام سے قائم کیا گیا ۱۸۱۸ء میں پادری کیری نے بنارس میں عیسائی کالج جے نارائن کالج کے نام سے قائم کیا تھا۔ پونا میں ۱۸۲۱ء میں ہندو کالج اور ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج قائم ہوا۔ انگریزی تعلیم کے نتیجے میں ہندو طبقے نے حکومت کے تمام شعبوں پر قبضہ کر لیا اور مسلمان بہت پیچھے رہ گئے۔ ان میں بے روزگاری بڑھ گئی۔ انگریزی تعلیم کے نتیجے میں جہاں ہندو طبقے نے معاشی مفادات حاصل کئے وہیں ان میں مذہبی حوالے سے غیر معمولی تبدیلی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ لارڈ میکالے

کے ایک خط سے جو انھوں نے اپنے والد کے نام لکھا تھا اس کا اظہار ہوتا ہے۔[9]

"اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے تحت ہندو رہتے ہیں۔ مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عمل درآمد ہوا تو پچیس تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہیں رہے گا۔"

صرف انگریزی تعلیم ہی نہیں ۱۸۳۳ء کے بعد سے یورپ سے پادریوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان پادریوں نے مذہبی تبلیغ کے جنون میں ہندوستان کے مذاہب پر بے جا حملے کر کے اہل ہند کی دل آزاری کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ وہ حالات تھے جس کی وجہ سے مسلمان سب سے پہلے بیدار ہوئے۔ ہندوسان میں مسلم عوام اور خواص کا ایک خاص طرز عمل رہا ہے۔ مسلم علماء جو شریعت کے پاسبان رہے ہیں انھیں کبھی یہ فکر نہیں ہوئی کہ ان کا بادشاہ کس قوم و مذہب کا شخص ہے۔ البتہ حکومت وقت نے جب بھی مسلمانوں کے مذہب کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے تو نہ صرف علماء بلکہ عوام الناس بھی اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب اکبر اعظم نے اسلام اور ہندو مذہب کو مسخ کر کے اور دونوں کے ملاپ اور کچھ اپنے ذاتی عقیدے کو بنیاد بنا کر دین الٰہی نامی نئے مذہبی طریقہ کار کا اعلان کیا تو اس دور کے علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کرنا جائز ہے۔ اس کے برخلاف جب مرہٹوں نے اُنیسویں صدی کے شروع میں مغل سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ملک کو تاخت و تاراج کیا اور بیشتر علاقوں پر سوراج قائم کر کے رعایا سے چوتھ وصول کرنا شروع کیا تو علماء سے پوچھا گیا تھا "کہ مسلمانوں کا ملک کفار کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے جو مسلمانوں کو نماز جمعہ اور عیدین ادا کرنے دیتے ہیں اور شریعت اسلام قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کی خواہش کے مطابق قاضی مقرر کرتے ہیں۔ مگر مسلمان حاکم مقرر کرانے کے لئے مسلمانوں کو کفار سے درخواست کرنی پڑتی ہے۔ ایسا ملک دارالاسلام ہے یا دارالحرب"[10] تو علماء جون پور نے فتویٰ دیا تھا کہ "ایسا ملک دارالاسلام ہے اور ایسے حاکم

یعنی مرہٹوں سے بغاوت جائز نہیں ہے۔'' اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے پیش نظر صرف یہ امر رہا ہے کہ انھیں شریعت پر عمل کرنے کی آزادی حاصل رہے خواہ عملداری مسلمان بادشاہ کی ہو یا غیر مسلم کی۔

لیکن برٹش انڈیا میں مسلمانوں نے سب سے پہلے بھانپ لیا کہ عوام کی معاشی، اقتصادی، تعلیمی اور مذہبی خودمختاری چھینی جارہی ہے۔ جب تک ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی غلبہ حاصل کرنے میں مصروف رہی عوام اور علماء نے خطرہ محسوس نہیں کیا۔ لیکن جب حالات نے یہ رخ اختیار کیا تو علماء بیدار ہوئے اور عوام کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھال لی۔ پھر ایسی عوامی جدوجہد شروع ہوئی جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا پیش خیمہ تھی۔ انگریزوں کے نفرت سے بھرپور ظالمانہ کارناموں اور وحشیانہ سرگرمیوں نے ہندوستانی عوام خاص طور پر علماء میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ علماء یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ، صوبوں کے نواب اور فوجی سربراہ غیر ملکی گوروں کا خاتمہ کردیں گے مگر پلاسی، بکسر، روہیل کھنڈ، میسور، دکن اور وسط ہند کی لڑائیوں میں ناکامی نے مایوسی کی کیفیت پیدا کردی۔ ٹھیک تاریخ کے اُسی موڑ پر ہندوستان کا ایک عالم اٹھا اور انگریزوں کے خلاف پہلا جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ شاہ عبدالعزیز فرزند شاہ ولی اللہ نے اعلان کیا کہ ''اسلام کی بنیادیں یقیناً ڈھادی گئی ہیں کیونکہ آزادی ضمیر، آزادی رائے اور شہری آزادی سے ابنائے ملک کو محروم کردیا گیا ہے لہذا ہر محبّ وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت کے خلاف اعلان جنگ کردے۔''[11] اس کے بعد شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحیٔ نے ایک خاص مذہبی فرمان جاری کیا جو کچھ یوں تھا۔ ''دہلی سے کلکتہ تک انگریزوں کے خلاف جنگ کرنا خدائی فیصلہ ہے۔'' ان دو اعلانات کا ذکر ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب ہمارے ہندوستانی مسلمان میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں ''ہندوستانی مسلمانوں نے انگریزوں کی طرف سے آنے والی تبدیلی کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور ان کی رہنمائی دو عالموں نے ان دو فرمانوں سے کی۔''[12] مسلمان علماء نے کس چیز کو بھانپ لیا تھا اُسے جاننے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ کے سامنے جو بیان دیا تھا وہ کافی ہے۔ ''خدا نے ہندوستان کی یہ عظیم الشان سلطنت انگلستان کو اس لئے سونپی ہے کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے

تک حضرت عیسیٰ مسیح کی فتح کا پرچم لہرانے لگے۔ہم میں سے ہر شخص کو اپنی پوری طاقت اس کام میں لگا دینی چاہیے کہ سارے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے اعلیٰ مقصد کو پورا کرنے میں ملک بھر کے اندر کہیں پر کسی وجہ سے ذرا بھی ڈھیل نہ آنے پائے۔''[۱۳]

عیسایت کی تبلیغ میں انگریز اس قدر دیوانے ہو گئے تھے کہ پنڈت سندر لال صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں۔'' جہاں جہاں انگریز حکومت قائم ہوتی جاتی تھی وہاں بے شمار پُرانے مندروں اور مسجدوں کی مغلیہ حکومت کی طرف سے دی گئی معافی کی جاگیریں چھین لی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہندو اور مسلمان قیدیوں کے لئے جیل خانوں میں بھی اپنے اپنے مذہب کے مطابق رہ سکنا ناممکن کر دیا گیا۔عیسائی پادری عام طور پر اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہندو اور مسلمان مذہبوں کی سخت برائی کرنے لگے۔ دونوں مذاہب کی پاک بزرگ ہستیوں کے لئے نازیبا الفاظ کا استعمال کرنے لگے۔''[۱۴]

اٹھارویں صدی میں صرف مغلیہ سلطنت کا سیاسی زوال ہی نہیں ہوا بلکہ عام مسلم معاشرہ، دینی، اخلاقی اور سماجی اعتبار سے ایک زوال پذیر معاشرہ تھا اس معاشرے میں شرافت و نجابت کا تعلق خون کے رشتہ سے وابستہ تھا۔ ذات پات کی بندشیں جو ہندو معاشرے میں ہمیشہ سے مذہبی اہمیت کی حامل رہی ہیں، وہی صورت مسلمانوں کی عملی زندگی میں بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس معاشرے میں توہمات اور رسم پرستی نے اصل مذہب کی جگہ لی لے تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اُردو میں اس معاشرے کی تصورکشی ان الفاظ میں کی ہے۔

''بہادری، شجاعت اور عسکریت کے عناصر ضائع ہو چکے ہیں عدم تحفظ کے احساس نے معاشرے کو بے عمل و مفلوج کر دیا ہے۔ اسی لئے یہ معاشرہ وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس پر چل کر اس پُر آشوب زمانے کو وقتی طور پر بھلا سکے۔ اس خود فراموشی کے لئے وہ ایک طرف شراب پر تکیہ کرتا ہے۔ میلے ٹھیلوں، عرس، چراغاں، گانے بجانے اور عیش کوشی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اور دوسری طرف تلاش سکون میں تصوف اور پیری مریدی کا سہارا لیتا ہے۔ بادشاہ سے

لے کر عوام تک سب یہی کر رہے ہیں۔اس معاشرے نے بزم آرائی، صہبا پرستی اور عیش کوشی کو تصوف سے ملا کر اسے بھی اپنے لئے مفید مطلب بنالیا ہے۔ یہ معاشرہ ثنویت کا شکار ہے۔اس کی شخصیت اور تہذیبی وحدت دوٹکڑے ہوگئی ہے۔عورت اور مرد دونوں اسے محبوب ہیں۔عشق مجازی اور عشق حقیقی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔اس کے مشاغل میں وہ روح نہیں ہے جس سے معاشرہ آگے بڑھتا ہے۔اس کے سامنے نہ کوئی جہت ہے اور نہ عظیم اجتماعی مقاصد قوم وملک کی فلاح وترقی کا تصور فرد کے ذہن سے معدوم ہو چکا ہے۔اسی لئے اس صدی میں ہمیں سورما اور بہادر نظر نہیں آتے بلکہ ان کی جگہ سازشی سفلے، بانکے، رنڈی، بھڑوے اور خواجہ سرا ملتے ہیں جنھوں نے سرکار دربار پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔معاشی حالات ابتر ہیں، خزانہ خالی ہے، تجارت بحران کا شکار ہے۔دستکار اور کاریگر پریشان حال ہیں۔کسان کے لئے پیٹ پالنا اور محصول ادا کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ ملک کی دولت غیر مفید اور غیر پیداواری کاموں پر صرف ہورہی ہے۔''[۴۹]

اس مایوسی اور دل شکستگی کی فضا میں تجدید اسلام اور احیائے علوم کی بنیاد رکھنے والی ہستی ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے ان کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔وہ دہلی میں ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور اپنی زبان اور قلم سے دو اہم کام کئے۔(۱) مسلمانوں کو ان کے حقیقی اعتقادی ورثے کی طرف لوٹایا (۲) حکومت کی غلط کاریوں پر نکتہ چینی کی اور اس کی درستگی کا پروگرام پیش کیا۔ شاہ صاحب پہلے ہندوستانی مفکر ہیں جنھوں نے ہندوستان کے دانشوروں کو اقتصادی انقلاب کا راستہ دکھایا۔ڈاکٹر تارچند نے شاہ صاحب کے کام کی قدر و قیمت کا یوں اعتراف کیا ہے۔

''سیاست کے میدان میں غالباً وہ واحد مسلم مفکر تھے جو اس امر پر صاف دماغ رکھتے تھے کہ اخلاق، سیاست اور اقتصادیات میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔معاشرتی اخلاقیات میں وہ عدل کو سب سے اونچا مقام دیتے ہیں جو ہمارے ذاتی

کردار میں مہذب برتاؤ، خوش خلقی اور آدابِ گفتار کی صورت نمایاں ہوتا ہے۔ جو مالی معاملات میں دیانت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں شہری آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کو جنم دیتا ہے۔ اور جب یہ صفت مساوات انسانی، باہمی محبت اور انسانی برادری کی بنیاد بن جاتی ہے تو معاشرتی نیکی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جب انسان عدل اختیار کرتے ہیں تو وہ ایک نیک کردار سوسائٹی کی تعمیر کرتے ہیں جو عین مرضی الٰہی ہے۔''[15]

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستانی عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر رہی تھی۔ شہری آزادی، دین و مذہب کی آزادی، معاشرتی نیکی کو برتنے کی آزادی اور مالی معاملات میں دیانت داری کے رویے کو برقرار رکھنے کی آزادی۔ سوسائٹی کے نیک کردار انسانوں کو تنگ کیا جا رہا تھا۔ سفلے اور موقعہ پرستوں کی سرپرستی کی جا رہی تھی۔ تو پھر وہی گھرانہ جس کے سارے افراد اس اصلاحی تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔

انیسویں صدی کے نصف اول کا یہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی تاریخ کا منظر نامہ ہے جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے تصور کو پروان چڑھایا۔ قبل اس کے کہ ہم جنگ آزادی کے عسکری پہلو کا جائزہ لیں، تاریخ کے چند چیدہ چیدہ واقعات کا ذکر ضروری ہے۔

علماء میں بزور شمشیر آزادی حاصل کرنے کا کام سب سے پہلے سید احمد شہید نے شروع کیا۔ سید احمد صاحب ۱۷۸۶ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ دلّی چلے آئے اور شاہ عبدالعزیز کی شاگردی اختیار کر لی۔ شاہ ولی اللہ کے پوتے سید اسماعیل شہید اور شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحی، سید احمد شہید کے ساتھ ہو گئے۔ سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر کے ۱۸۲۴ء میں بریلی سے نکلے۔ سکھوں کے خلاف جہاد کا فیصلہ اس لئے کیا گیا تھا کہ سکھ انگریزوں سے معاہدہ کر کے پنجاب میں انگریز نواز حکومت تشکیل دے چکے تھے اور وہاں مسلم اکثریت پر وہی مظالم توڑ رہے تھے جو سرکار انگریزی اپنی عملداری میں روا رکھی ہوئی تھی۔ مجاہدین کی جماعت بہاولپور، حیدرآباد

(سندھ)، شکار پور، درہ بولان، قندھار اور کابل سے ہوتی ہوئی خیبر کے راستے پشاور پہنچ گئی اور شہر پر قبضہ کر کے ۱۸۲۷ء میں آزاد فلاحی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ مقامی پٹھان جنگی معاشرتی زندگی قبائلی عصبیت کی بنیاد پر پروان چڑھی ہوئی تھی ایک دستوری مرکزی اور فلاحی حکومت کا ساتھ نہ دے پائے۔ بہتوں نے سید صاحب کا ساتھ نہیں دیا۔ اور کچھ تو سکھوں کے حلیف بن کر سید صاحب کے خلاف ہو گئے۔ جنانچہ یہ تحریک ۱۸۳۱ء میں سید احمد اور سید اسماعیل کے شہادت کے بعد بکھر گئی۔ لیکن تحریک مری نہیں ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۷ء تک بے شمار مجاہدین نے اپنی جان و مال کی قربانی دے کر اس تحریک کو زندہ رکھا۔ سکھوں کی خالصہ حکومت سید احمد کی شہادت کے چند سال بعد ختم ہو گئی اور انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کر لیا۔ تحریکِ مجاہدین تقریباً نصف صدی تک کمپنی بہادر کے لئے وبالِ جان بنی رہی۔ [16] اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۲۴ء کی تحریکِ مجاہدین ہی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی علم بردار رہی۔ کیونکہ جنگِ آزادی کے رہنماؤں میں جو ممتاز افراد تھے وہ تحریکِ مجاہدین کے تربیت یافتہ اور اس کے حلقۂ اثر کے لوگ تھے۔ اس تحریک کے احیاء اس کے عروج اور بعد بھی انگریزوں نے نہایت چالاکی سے اس تحریک کے رہنماؤں پر وہابیت کا الزام لگایا ہے۔

اس وقت وہابیت اور لفظِ وہابی مشرق وسطیٰ، افریقہ، ایران، افغانستان اور سرحدی علاقے میں نفرت انگیز اثرات کا حامل تھا۔ [17] انگریزوں نے تحریکِ مجاہدین اور اس کے حلقۂ اثر کے وہ لوگ جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں رہنمائی کا کام کر رہے تھے ان پر بھی وہابیت کا الزام لگا کر نادان مسلم عوام کو ان سے برگشتہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ چنانچہ ہمارے مورخین نے اس الزام کا تجزیہ کر کے صحیح رائے پر پہنچنے کے بجائے سرے سے انکار کیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وہابی علماء نے شرکت نہیں کی۔ [18] پھر اس بنیاد پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ جنگِ آزادی میں علماء ہند کا کوئی اہم رول نہیں تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پس منظر کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں ان چھوٹی چھوٹی عوامی عسکری تحریکوں پر نظر ڈالنی چاہیے جو انیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سالوں کے دوران رونما ہوئے ہیں۔

۱۔ ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر کے بعد ہر سال صوبہ بہار و بنگال میں ہندوستانیوں اور مسلمان فقیروں کی مذہبی انجمنیں بغاوت کرواتی تھیں۔ انھوں نے کئی بار پورے جنگی قواعد سے انگریزی فوجوں سے مقابلہ کیا۔[۱۸]

۲۔ میسور کی چوتھی جنگ ۱۷۹۹ء کے بعد مالابار کے مسلمان جاگیردار اور ہندو راجے ۶ سال تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔ مالابار کے علاقے میں ۱۸۱۲ء تک ان شورشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ٹیپو کا ایک مرہٹہ سپاہ سالار ڈھونڈیا واگ جس کو سلطان نے ملک جہاں خان کا خطاب دے کر اپنی فوج میں سالار مقرر کیا تھا ایک سال تک مسلسل انگریزوں سے جنگ کرتا رہا ۱۸۰۰ء میں ایک لڑائی کے دوران وہ شہید ہو گیا۔ انگریز واقعہ نگاروں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر وہ مارا نہ جاتا تو دوسرا حیدر علی ثابت ہوتا۔[۱۸]

۳۔ ۱۸۱۶ء میں کاٹھیاواڑ، کچھ اور بڑودہ میں بغاوت ہوئی۔ وہاں کے جاگیردار راؤ بھرمل کے پاس عرب سپاہی تھے جو انگریزوں سے مسلسل کئی سال تک لڑتے رہے۔ ۱۸۱۹ء میں خاندیس کے بھیل قبیلے نے بغاوت کر دی۔[۱۸]

۴۔ آسام میں ۱۸۳۰ء تک اور اڑیسہ میں ۱۸۴۹ء تک مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں۔ ٹراونکور میں ۱۸۰۴ء میں بغاوت ہوئی جس کا سبب ریاست کے اندرونی معاملات میں کمپنی کی بے جا دخل اندازی کہا جاتا ہے۔ یہاں کے دیوان ویلوتا مپنی نے ۱۸۰۸ء میں فوج جمع کر کے انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا۔ ۱۸۱۶ء میں بریلی میں ایک خوں ریز بغاوت ہوئی جس میں ایک مقامی مقتدر عالم مفتی محمد عیوض نے خود فوجی بغاوت میں حصہ لیا اور سخت زخمی ہوئے۔[۱۸]

۵۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد سردار شام سنگھ نے انگریزی فوجوں پر حملہ کیا اور لڑتے ہوئے میدان جنگ میں کام آئے۔ ۱۸۴۹ء میں شیر سنگھ اٹاری اور مول راج نے ملکر بغاوت کی اور کمانڈر اینڈرسن کو قتل کر دیا۔[۱۸]

۶۔ ۱۸۰۰ء میں نظام حیدر آباد نے انگریزوں کے حق میں معاہدہ غلامی پر دستخط کر دیے تو

راجہ مہی پت رام (یہ سکندر جاہ نظام سوم کے فوجی مشیر تھے) نے اس معاہدے کے خلاف حیدر آباد کے اندر اور باہر وطن دوست طاقتوں کو منظّم کیا اور انگریز اقتدار کو ختم کرنے کی دھن میں اپنی جان کی قربانی پیش کی۔ مہی پت رام کے بعد شہزادہ مبارز الدولہ (نواب سکندر جاہ کے فرزند) نے سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کا ساتھ دیا مہاراجہ جودھپور، راجہ ستارہ، مہاراجہ پٹیالہ، نواب بھوپال، نواب باندہ اور نواب کرنول کو پیغامات روانہ کئے اور ان کی مدد سے انگریزوں پر فوج کشی کا پلان بنایا، ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کو اس تیاری کا پتہ چل گیا۔ انگریزی فوج نے مبارز الدولہ کے مکان پر حملہ کر دیا۔ نواب سکندر جاہ انگریزی فوج کی پیش قدمی کو نہیں روک سکے دو روز کی مسلسل گولہ باری کے بعد انگریزی فوج نے مبارز الدولہ کے مکان میں داخل ہو کر انھیں گرفتار کر لیا۔ اور ساری عمر جیل میں رکھا۔ ۱۹

۷۔ ۱۸۴۰ء میں ایک برہمن نرسیم دتاتریہ کی رہنمائی میں نظام حیدر آباد کی عرب فوج نے قلعہ بادامی (ضلع وزاگاپٹم میں واقع ہے) پر قبضہ کر کے نرسیم دتاتریہ کی حکومت کا اعلان کیا۔ اسی سال دکھنی علاقوں کے پالیگاروں نے مختلف مقامات مثلاً بلاری، کڑپہ، اننت پور اور کرنول وغیرہ میں اتنی زبردست بغاوتیں کیں کہ انگریز مورخوں نے بھی ان کو آزادی کی خاطر دفاعی جنگ کرنے پر خراج تحسین ادا کیا ہے۔ ۲۰

۸۔ ۱۸۰۶ء کی ویلور بغاوت خاص طور پر اہم ہے۔ ویلور میں جو مدراس میں واقع ہے سلطان ٹیپو کے خاندان کو نظر بند کیا گیا تھا۔ بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر اس خاندان کو کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔ بغاوت کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔ سلطان کے خاندان کی موجودگی سے وہاں کی انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں کے جذبات مشتعل ہو رہے تھے۔ اور باقاعدہ منظّم کوشش کے ذریعہ بغاوت کی تیاریاں کی گئیں تھیں۔ اس لئے اس بغاوت کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ریہرسل کہا جاتا ہے۔ ۲۰

جنگ آزادی کے پس منظر کے سلسلے میں ہم نے ان عوامل اور محرکات کی نشاندہی کی ہے جن کی بنا پر انگریزی فوج کے دیسی سپاہی، ہندوستانی عوام اور ان کے رہنما ہتھیار اُٹھا لینے پر

مجبور ہوئے۔ان اسباب میں ایک اہم عنصر جس کا ذکر کیے بغیر منظر نامہ مکمل نہیں ہوگا وہ ہے انگریزوں کا حد سے بڑھا ہوا احساس برتری کا تصور۔اس جذبے کے تحت انگریزوں نے انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں،سول حکام،مغل بادشاہوں،دیسی ریاستوں اور عوام کے ساتھ نہایت ذلت آمیز برتاؤں روا رکھا۔

انگریزی فوج کے دیسی سپاہوں کے ساتھ نہایت ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا۔معمولی باتوں پر ہولناک سزا دی جاتی تھی۔جنگ میں زخمی سپاہیوں کو ہسپتال بھیجنے کے بجائے گولی ماردی جاتی تھی۔جنگ بکسر کے بعد سپاہیوں نے انعام اور تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا تو چوبیس سپاہیوں اور چار افسروں کو توپ سے اڑادیا گیا۔جنگ برما کے موقع پر جب سپاہ نے مہنگائی الاونس مانگا کیوں کہ رنگون میں مہنگائی زیادہ تھی تو کلکتے سے گورہ فوج نے بارک پور آکر ہندوستانی سپاہیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔اس طرح کے سینکڑوں واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔[۲۱]

مغل بادشاہ ہندوستانی عوام میں صدیوں کی روایات کی بناپر قابل عزت مانے جاتے تھے۔انگریزوں نے طاقت کے نشے میں مغل بادشاہوں کے ساتھ نہایت ذلت آمیز برتاؤ کرنا شروع کیا۔خاص طور پر شاہ عالم ثانی،اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ اوران کے پورے خاندان کے ساتھ شاہی آداب کو بالائے طاق رکھ کر رسمی عزت اور احترام کا برتاؤ ترک کردیا گیا۔انگریزوں کے اس رویے سے ہندوستانی عوام اور خواص میں کمپنی بہادر کے خلاف سخت نفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔[۲۱]

۱۸۵۶ء تک انگریزوں نے تقریباً ساری دیسی ریاستوں کے اختیارات کو محدود کر کے والیان ریاستوں کو قریب قریب بے دست وپا کردیا۔بیشتر ریاستوں کو ڈرادھمکا کر اور بعض ریاستوں کے خلاف فوجی کاروائی کر کے ان کے خزانوں پر قبضہ کرلیا۔محلات میں گھس کر نوابوں اور راجاؤں کی ذاتی دولت لوٹ لی گئی،حرم سراؤں کی عورتوں کو ذلیل کیا گیا۔۱۸۴۹ء میں ڈلہوزی نے فوجی کاروائی کر کے رنجیت سنگھ کے پنجاب کا الحاق کرلیا۔راجہ کی جاگیر حتیٰ کہ محل کے تمام زیورات پر قبضہ کرلیا گیا۔ان زیورات میں کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا۔۱۸۵۶ء میں ریاست

اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے ریاست کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اُودھ پر انگریزی تسلط سے ہزاروں لوگ جو ریاست کے مختلف محکموں میں کام کرتے تھے بے روزگار ہو گئے۔ ریاست کی فوج کے ستر ہزار سپاہی فوج سے نکال دئے گئے۔☆ ان ستر ہزار سپاہیوں میں ۲۵ ہزار برہمن سپاہی تھے جو بے روزگار ہو گئے۔ اور اودھ کے جاگیردار اور زمین دار جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اپنی زمینات کھو بیٹھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اُودھ کے ۳۵ ہزار زمین داروں میں سے ۲۱ ہزار کو ان کی زمینات سے بے دخل کر دیا گیا۔ انگریزوں کے ہاتھوں ریاست اُودھ کی ضبطی کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ اب کون محفوظ رہ سکتا ہے۔ اگر انگریز سرکار نے اُودھ جیسے وفادار دوست کی حکومت چھین لی ہے تو پھر انگریزوں کے ساتھ وفاداری کرنے سے کیا فائدہ۔ ۲۱

جنگ آزادی کی تیاری

یہی وقت تھا جب آزادی کے متوالے ایسی جنگ کی تیاری کر رہے تھے جس میں ہزاروں عوام، علماء، دانشور، مزدور، کسان، چھوٹے بڑے جاگیردار اور انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہی حصہ لینے والے تھے۔ ارنسٹ جونس نے اس جنگ کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ عوامی جنگ ہے۔ اور ہندوستان کی کسی جنگ میں آج تک عوام کی اتنی بڑی تعداد نے حصہ نہیں لیا لیکن ایک بات کا ہمیں یقین ہے اور وہ یہ کہ خواہ بغاوت دبائی جائے یا نہ دبائی جائے لیکن ہندوستان ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔" ۲۲

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے بے شک ہزاروں نہیں لاکھوں عوام ہیں

☆ ایک عبرت انگیز نوٹ: سامراج کا مزاج بدلا نہیں ہے۔ ۱۸۵۶ء میں جو کھیل اُودھ میں کھیلا گیا تھا وہی کھیل آج عراق میں کھیلا جا رہا ہے۔ اس وقت برطانیہ سُپر پاور تھا اور ہندوستانیوں کو ملوکیت کے چنگل سے نکال کر دستوری حکومت کا سبق سکھایا جا رہا تھا۔ آج امریکہ سُپر پاور ہے اور برطانیہ اس کا حلیف اور عراقیوں کو آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کے جنگل سے نکال کر جمہوریت کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔ اس وقت اُودھ کی اپنی فوج کو بے دخل کر کے سامراج نے مقامی سپاہیوں پر مشتمل اپنی پسند کی فوج تشکیل دی تھی، اور آج عراق کی اپنی فوج کو بے دخل کر کے جمہوریت کے داعی اپنی پسند کی فوج تشکیل دے رہے ہیں۔

لیکن اِسے منظم کرنے والوں میں چھ لوگوں کے نام سرفہرست ہیں۔

ا۔ گولکنڈے کے آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کے پرپوتے دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی۔ ۲۔ مرہٹہ پیشوا باجی راؤ کے منہ بولے (متبنیٰ) بیٹے ناناوندھونپت (یہ عام طور پر نانا صاحب کے نام سے مشہور ہیں) نانا صاحب باجی راؤ کے پورے خاندان کے ساتھ کانپور کے قریب بٹھور نام کے ایک مقام میں رہتے تھے۔ ۳۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ ۴۔ نانا صاحب کے وزیر مولوی عظیم اللہ خان۔ ۵۔ روہیلہ سردار جنرل بخت خان۔ اور ۶۔ واجد علی شاہ کے وزیر علی نقی خان۔

مولوی احمد اللہ شاہ نے لکھنو سے آگرہ تک گاؤں گاؤں، شہر شہر گھوم کر عوام کو جنگ کے لئے تیار کیا۔ ان کے جلسوں میں دس دس ہزار لوگ شریک ہوتے تھے۔ نانا صاحب نے ۱۸۵۷ء سے دوسال قبل ایک خفیہ انقلابی جماعت بنائی۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں اپنے وزیر مولوی عظیم اللہ خان کو لیکر وہ مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے دہلی پہنچے اور بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کر کے جنگ آزادی شروع کرنے کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کا دن مقرر کیا گیا۔ اس دن سارے ہندوستان میں مختلف فوجی چھاونیوں سے ایک ساتھ جنگ شروع کرنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ نانا صاحب نے اس کے بعد ہندوستان کے گوشے گوشے میں اپنے قاصد روانہ کئے۔ نانا صاحب مولوی عظیم اللہ خان کے ساتھ دہلی سے لکھنو پہنچے۔ مولوی احمد اللہ شاہ سے ملاقات کی اور واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کو جنگ کی پلاننگ اور تاریخ سے آگاہ کیا۔ روہیلہ سردار جنرل بخت خان سب سے قابل فوجی رہنما تھے۔ یہ بریلی کے صوبہ دار تھے اور اس عہدے سے قبل جلال آباد اور نیچ وغیرہ میں معزز فوجی عہدے پر رہ چکے تھے۔ جنرل بخت خان نے وسط ہند کے روہیلوں اور پٹھانوں کو جنگ میں حصہ لینے کے لئے تیار کیا۔ فوجی بھرتی شروع کی اور ہتھیار جمع کئے۔ واجد علی شاہ کے معزول وزیر علی نقی خان نے کلکتہ میں بیٹھ کر مسلمان فقیروں اور ہندو سادھوں کے بھیس میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ شمالی ہند کی فوجی چھاونیوں میں خفیہ پیغامات بھیجنا شروع کیا۔ علی نقی خان کے دعوت ناموں کے جواب میں ہزاروں ہندو سپاہیوں اور ان کے افسروں نے گنگا جل ہاتھ میں لیکر اور مسلمان سپاہیوں اور انکے

افسروں نے قران پاک ہاتھ میں لے کر قومی جنگ آزادی میں حصہ لینے اور انگریزوں کو ملک سے نکال دینے کی قسم کھائی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی یگانہ روزگار عالم، عربی کے ماہر ادیب وشاعر، بڑے مفکر مدبر اور سیاست دان تھے کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل آپ نے اکثر والیان ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ جنگ شروع ہوتے ہی آپ دہلی پہنچ گئے اور جنرل بخت خان کی تحریک پر جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے پیش کیا۔ اس فتویٰ کی بنیاد پر ہزاروں سپاہی جنرل بخت خان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ۲۳

انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو بیدار کرنے اور عوام کو جنگ کے بارے میں مطلع کرنے کے لئے انقلابی لیڈروں نے گیہوں کے آٹے کی چپاتیاں اور کنول کے سرخ پھول کو بطور علامت استعمال کیا۔ ۱۸۵۷ء کے پہلے ۳ ماہ میں چپاتیاں تقریباً ہر گاؤں میں نہایت تیزی کے ساتھ تقسیم ہوئیں۔ جنوری سے مارچ تک تمام شمالی ہند میں بارک پور سے انبالہ تک اور دہلی سے ساگر اور نربدا تک کے علاقے میں پھیل چکی تھیں۔ یہ چپاتیاں شمالی ہند کے ہر فوجی چھاونی میں بھی تقسیم ہوئیں۔ ان کی تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک آدمی پانچ چپاتیاں لے کر اپنے گاؤں سے نکلتا اور پانچ گاؤں میں پہنچ کر ایک ایک چپاتی ایک آدمی کو دیتا اور اسے ہدایت کرتا کہ وہ اسی طرح کی چپاتیاں پانچ گاؤں میں تقسیم کرے۔ چپاتیوں کی تقسیم کا خیال غالباً چین سے ہندوستان آیا ہوگا۔ چینی تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۳۶۸ء میں منگولوں کی حکومت ختم کرنے کے لئے وہاں کے عوام میں اسی طرح روٹیاں تقسیم کی گیں تھیں۔ اس پیغام رسانی کے بعد چینی عوام نے متحدہ ہو کر منگولوں کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔

کنول کے پھول کی تقسیم بھی چپاتیوں کی طرح تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کنول کا پھول فوجی چھاونیوں میں تقسیم کیا گیا۔ طریقہ کار یہ تھا کہ ایک آدمی کنول کا ایک پھول لیکر فوجی چھاونی میں جاتا اور پھول ایک ہندوستانی سپاہی کو پکڑا دیتا۔ وہ سارے سپاہیوں میں گردش کر کے پھر پہلے آدمی کے پاس پہنچ جاتا۔ کنول کا سرخ پھول دیکھ کر سپاہی کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور وہ غضب ناک نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر پھول دوسرے سپاہی کو پکڑا دیتا۔ پھول دیکھ کر سپاہیوں میں جو تبدیلی رونما ہوئی اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے سپاہیوں کو پہلے سے علم تھا کہ پھول کے

ذریعہ انہیں جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار رہنے کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ کنول کا پھول ہندوستانیوں کے لئے مذہبی اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ تخلیق کے دیوتا برہما کنول کے پھول پر بیٹھ کر اپنی مخلوق کو دیکھنے کے لئے آسمانوں سے زمین پر آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب سپاہی پھول کی طرف دیکھتا ہے تو وہ برہما کا درشن کرتا ہے اور براہ راست ان کے پیغام کو سنتا ہے۔ اس طرح کے ہزاروں پھول پشاور سے بارک پور (بنگال) تک مختلف چھاونیوں میں گھمائے گئے۔[24]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر (فوجی بغاوت) کا نام دیا ہے۔ یعنی ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت۔ بغاوت کی وجوہات کے بارے میں انگریز مورخوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا دعویٰ ہے کہ کمپنی نے فوج کے لئے نئے کارتوس تیار کروائے تھے۔ وہ کارتوس ۱۸۵۷ء کے ابتداء میں فوج کو دئے گئے۔ ان کارتوسوں پر چربی سے چکنی کی ہوئی ایک جھلی چپکائی جاتی تھی جسے دانتوں سے کھینچنا پڑتا تھا۔ کارتوسوں کی تیاری کا کارخانہ ڈم ڈم میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کارخانے کے ایک ملازم سے ہندوستانی سپاہیوں کو معلوم ہوا کہ کارتوسوں کی تیاری میں گائے اور سور کی ملی جھلی چربی استعمال کی جا رہی ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۸۵۷ء میں ہی تربیت گاہ کے سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کارتوسوں کے استعمال کے لئے جب سپاہیوں پر دباؤ ڈالا گیا تو بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ کی ابتداء کارتوسوں کے تنازع سے ہوئی۔ لیکن صرف کارتوس ہی بغاوت کی وجہ تھے اس کی تردید ان تاریخی حقائق سے ہوتی ہے جن کا ذکر ہم نے پس منظر اور خاص طور پر جنگ کی تیاری کے سلسلے میں کیا ہے۔

جنگ آزادی: عسکری جدوجہد کی تفصیلات:

انقلابی لیڈروں نے جنگ آزادی کی تیاری کی تھی اور شروعات کے لئے نہایت احتیاط سے خفیہ طور پر ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ مقرر کی تھی۔ مگر میرٹھ میں تاریخ مقررہ سے پہلے جنگ شروع ہوگئی۔ جس واقعہ کی بنا پر میرٹھ کے ہندوستانی سپاہیوں نے ہتھیار اٹھا لیے، تقریباً ویسا ہی

واقعہ فروری ۱۸۵۷ء میں برہام پور کی رجمنٹ ۱۹ کو پیش آیا۔ ۲۶ فروری کو رجمنٹ ۱۹ کے سپاہیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا۔ انگریز افسروں نے حکم دیا کہ کارتوس استعمال نہیں کرو گے تو سخت سزا دی جائے گی۔ سپاہیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ ہتھیار اٹھا لینے کی دھمکی دی۔ تب برما سے ایک انگریز سپاہیوں پر مشتمل رجمنٹ بلائی گئی اور رجمنٹ ۱۹ کے سپاہیوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ بارک پور کی رجمنٹ ۳۴ کے ایک بہادر سپاہی منگل پانڈے سے یہ برداشت نہ ہوسکا کہ اس کے سامنے رجمنٹ ۱۹ کے سپاہیوں کو گولی ماردی جائے۔ اس نے اپنے ساتھیوں پر زور ڈالا کہ بغاوت کے لئے مئی کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ فوری بغاوت شروع کردی جائے مگر اس کے ساتھی قبل از وقت بغاوت کے لئے راضی نہ ہوئے تو وہ خود بندوق سنبھال کر میدان میں نکل آیا۔ انگریز افسر نے منگل پانڈے کو گرفتار کرنے کا حکم دیا مگر اس کے ساتھی ٹس سے مس نہ ہوئے تو افسر نے پھر سے حکم کو دھرایا۔ تب منگل پانڈے نے افسر پر گولی چلادی۔ کافی کشمکش اور خون خرابے کے بعد گورے سپاہیوں نے منگل پانڈے کو گرفتار کرلیا اور ۸/اپریل ۱۸۵۷ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد سارے ہندوستانی سپاہیوں کو جنھوں نے منگل پانڈے کو گرفتار کرنے کا حکم نہیں مانا تھا ہولناک سزائیں دی گئیں۔ برہام پور کی رجمنٹ ۱۹ اور بارک پور کی رجمنٹ ۳۴ کے سپاہیوں سے ہتھیار لے کر انھیں برخاست کردیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً ساری فوجی چھاونیوں میں آگ سی لگ گئی۔ اور کارتوسوں کے استعمال سے انکار کے بے شمار واقعات ہونے لگے۔ لیکن ہندوستان گیر جس جنگ کا پلان بنایا گیا تھا وہ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔

وہ جنگ میرٹھ سے بروز اتوار ۱۰/مئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہوئی۔ ۶/مئی کو میرٹھ کی فوجی چھاونی کے سپاہیوں نے چربی والے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کردیا۔ اس جرم میں ۵۸ سپاہیوں کا کورٹ مارشل ہوا اور ۹/مئی ۱۸۵۷ء کو انھیں دس دس سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔ یہ ۵۸ سپاہی افسر رینک کے تھے جو اپنی فوج کی ناک سمجھے جاتے تھے۔ ان کی وردیاں پیچھے سے پھاڑ دی گئیں، فوجی سنگینوں کے پہرے میں اور تمام سپاہیوں کے سامنے نہایت حقارت سے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر ان کے فوجی نشانات چھین لیے گئے۔ اس طرح ذلیل کر کے ان کو

جیل بھیجا گیا۔ ہندوستانی سپاہی چپ چاپ یہ تماشا دیکھتے اور پیچ و تاب کھاتے رہے۔ گورہ فوج کی سنگینیں گھیرے ہوئے تھیں اور توپ خانہ سامنے تھا۔ لیکن دوسرے دن ہندوستانی سپاہیوں نے ہتھیار اٹھالیے۔ فوجی چھاؤنی کے سارے انگریز افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار کر ہندوستانی سپاہی جن کی تعداد ۲ ہزار تھی آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے دہلی پہنچ گئے۔ یوں وہ جنگ جو ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو سارے ہندوستان میں ایک ساتھ شروع ہونی تھی میرٹھ کے اتفاقی حادثہ کی وجہ سے قبل از وقت شروع ہوگئی۔ اکثر انگریز مورخین کا خیال ہے کہ میرٹھ میں وقت سے پہلے بغاوت کا شروع ہو جانا انگریزوں کے لئے برکت اور ہندوستانی انقلابیوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ چنانچہ مالے سن کا کہنا ہے کہ "اگر ٹھیک طے شدہ وقت کے مطابق ایک ساتھ ایک تاریخ کو ہی سارے ہندوستان میں جنگ آزادی کی شروعات ہوتی تو ہندوستان میں ایک بھی انگریز نہ بچتا۔ اور انگریزی حکومت کا اُسی وقت خاتمہ ہو گیا ہوتا"۔[25]

مسٹر ساور کر لکھتے ہیں کہ "تقریباً ۲ ہزار سپاہی سوار اور پیدل میرٹھ سے دہلی آئے اور بہادر شاہ ظفر سے رہ نمائی کی درخواست کی۔ جب بادشاہ نے فوج اور خزانہ نہ ہونے کا عذر کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم تمام انگریزی خزانے لوٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے، بادشاہ نے رہ نمائی قبول کر لی تو تالیوں کی پرزور گونج سنائی دی۔"[26]

۱۱ رمئی کو بادشاہ کی سلامی میں ۲۱ توپیں داغی گیں۔ مغل شہزادوں، مرزا مغل، مرزا خضر سلطان، مرزا ابوبکر، مرزا سید و اور مرزا عبداللہ وغیرہ کو مختلف انقلابی فوجی دستوں کا سردار مقرر کیا گیا۔ مرزا مغل کمانڈران چیف بنائے گئے۔ اس نئے انتظام کے ساتھ ہی جنگ آزادی کی ناکامی کی بنیاد بھی پڑگئی کیونکہ ان شہزادوں نے میدان جنگ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ انگریزوں کو دہلی سے بے دخل کرنے کے لئے متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ ۱۱ رمئی سے ۳ جون تک دہلی انگریزوں سے خالی ہوگئی۔ اس دوران اطراف واکناف سے بے شمار آزاد فوجی دستے جمنا کا پل پار کر کے دہلی میں داخل ہوتے رہے۔ ان دنوں جنرل صمد خان فوج کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو بریلی کے صوبہ دار جنرل بخت خان اپنے چودہ ہزار لشکر اور خزانے کے ساتھ دہلی میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ نانا صاحب کے بھائی

بالا صاحب اور مولانا فضل حق خیر آبادی بھی دہلی آئے۔ ان کے ہمراہ کفن بردوش مجاہدین کی فوج بھی تھی جن کی رہنمائی مولانا سرفراز علی کر رہے تھے۔ بہادر شاہ نے جنرل بخت خان کو دہلی کا منتظم اور فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے انھیں لارڈ گورنر کا خطاب دیا۔ جنرل بخت خان کے دہلی میں داخل ہوتے ہی انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لارڈ کیننگ نے فوراً مدراس، رنگون، بمبی اور پنجاب سے تازہ دم فوجیں دہلی کی طرف روانہ کر دیں۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کی Opium Trade کے خلاف چین میں شورش برپا ہوئی تھی۔ اس کو چین کی ٹائپنگ بغاوت کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں دوسری جنگِ افیون (2nd opium war) چھڑ گئی تھی۔ برطانیہ کی فوجیں اس بغاوت کو کچلنے کے لئے چین جا رہی تھیں۔ لارڈ کیننگ نے ان فوجوں کو رنگون کے راستے ہندوستان طلب کر لیا۔[27] انگریزوں کا ایقان تھا کہ ہندوستان میں انگریزی راج کو باقی رکھنا ہو تو ضروری تھا کہ پہلے دہلی فتح کی جائے لہٰذا لارڈ کیننگ نے ساری فوجی طاقت دہلی فتح کرنے کے لئے لگا دی۔ یہاں انقلابی لیڈروں کی واضح کوتاہی اور جنگی حکمت عملی سے عدم واقفیت کا ثبوت ملتا ہے۔ جنگ کے اس نازک موڑ پر انقلابی لیڈروں کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی ساری طاقت دہلی کو بچانے اور لال قلعے کے سامنے انگریز فوجوں کو تہس نہس کرنے کے لیے استعمال کرتے۔ اس کے بجائے تمام انقلابی لیڈر اپنے اپنے علاقوں میں انگریزی فوج سے لڑنے میں مصروف رہے اور جنرل بخت خان تنہا نہایت سنگین حالات اور بے سروسامانی کے باوجود دہلی کا دفاع کرتے رہے۔ چنانچہ جنرل بخت خان نے ۲ر جولائی سے ۱۵ر ستمبر تک دہلی کو بچائے رکھا۔ دہلی فتح کرنے کے لیے انگریزوں نے سخت نقصان برداشت کیا۔ ان کے سینکڑوں سپاہی اور کئی مشہور افسر مارے گئے۔ ادھر ہزاروں ہندو اور مسلمان سپاہیوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی۔ ۱۵ر ستمبر تک دہلی کا ہر کوچہ و بازار میدان جنگ بن گیا۔ ۲۰ر ستمبر کو بہادر شاہ ظفر، مرزا مغل، مرزا ابو بکر، مرزا خضر سلطان اور مرزا عبداللہ کو انگریزوں نے ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کر لیا۔ اسی روز سارے شہزادوں کو قتل کر دیا گیا۔ اور ان کے سروں کو خوان میں رکھ کر بہادر شاہ کے سامنے لایا گیا۔ تو اس پر بوڑھے بادشاہ نے کہا۔

"الحمد اللہ! تیمور کی اولاد اسی طرح سرخ رو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی ہے۔"

یوں دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن دہلی کی فتح سے جنگ آزادی ختم نہیں ہوئی۔ یہ جنگ سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹ رجون ۱۸۵۸ء تک جنگ کے شعلے ہندوستان کے ۳ چوتھائی رقبہ پر بھڑکتے رہے۔ اس وسیع وعریض علاقے میں سینکڑوں ایسے شہر اور مقامات ہیں جہاں بے سروسامان مجاہدین کی قوت مدافعت نے انگریزوں کو حیران کر دیا تھا۔ ان تمام مقامات کی جنگی تفصیلات کا ذکر اس مختصر سے مضمون کے لئے طوالت کا باعث ہوگا۔ لیکن چند ایک ایسے شہر اور مقامات ہیں جن کا ذکر کئے بغیر جنگ آزادی کا بیان تشنہ رہ جائے گا۔

لکھنو:

لکھنو میں کمپنی بہادر کی بالادستی سے چھٹکارا پانے کے لئے عوامی تحریک بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ یہاں ایک انقلابی جماعت تھی جس نے کابل کے امیر دوست محمد خان کو مدد کے لئے خط لکھا تھا۔ انگریزوں کا دعویٰ ہے کہ اگست ۱۸۵۵ء میں یہ خط ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں کمپنی نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے ریاست اُودھ کا الحاق کر لیا تھا۔ ممکن ہے ان سرگرمیوں کی وجہ سے الحاق کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ الحاق کے بعد یہاں کی انقلابی جماعت نے جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ مولانا احمد اللہ شاہ فقیروں کے لباس میں سرگرم عمل تھے۔ خفیہ طور پر فوجی بھرتی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں تین نام سامنے آتے ہیں جو مختلف علاقوں میں فوجی بھرتی کا کام انجام دے رہے تھے۔ فقیر قادر علی شاہ، محمود حسین کمیدان اور نواب محسن الدولہ نے مل کر تقریباً ۱۲ ہزار سپاہی تیار کر لیے تھے۔ یہ وہ سپاہی تھے جو ریاست کے الحاق کے بعد اودھ کی باضابطہ فوج سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کی سرگرمیوں سے انگریز واقف تھے۔ پولس کے ذریعہ انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر پولس نے انگریزوں کے احکامات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تب کمپنی کی ایک باضابطہ فوج نے معمولی جھڑپ کے بعد مولانا کو فیض آباد میں گرفتار کر لیا۔

۳۰رمئی ۱۸۵۷ء کو لکھنو میں متعینہ فوج کے دیسی سپاہیوں نے بغاوت کردی۔ ۳رجون کو خیرآباد ڈویژن کے ہیڈکوارٹر سیتاپور میں بغاوت پھوٹ پڑی اور فیض آباد میں ۸رجون کو بغاوت شروع ہوگئی۔ شہر کے عوام جو مولانا کی گرفتاری سے مشتعل ہوچکے تھے اور سپاہی بہ یک وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ صوبہ دار دلیپ سنگھ نے رہنمائی کی۔ انگریز افسروں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا اور مولانا کو جیل سے چھڑالیا گیا۔ ۳۰رجون تک مختلف چھوٹی بڑی جھڑپوں کے بعد انقلابی فوجوں نے انگریزوں کو لکھنو سے بے دخل کردیا۔ اب لکھنو اور بڑی حد تک ریاست اودھ نے اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرلی۔ ۵رجولائی کو معزول نواب واجد علی شاہ کے ۱۱ سالہ بیٹے برجیس قدر کو لکھنو کا حاکم مقرر کیا گیا اور ان کی والدہ بیگم حضرت محل نے انتظامات سنبھال لئے۔

۲۰رستمبر کو انگریزی فوجیں ہیولاک کی سرکردگی میں لکھنو کی طرف بڑھیں اور انقلابی فوج کا محاصرہ توڑ کر ریزیڈنسی میں داخل ہوگیں۔ لکھنو شہر پر مکمل قبضہ کرنے سے پہلے انگریزوں نے آخری جنگ ۱۰رمارچ ۱۸۵۸ کو لڑی۔ یہ لڑائی شہر کے اندر اور باہر ۱۰ روز تک چلتی رہی جنگ کے دوران بیگم حضرت محل ہاتھی پر سوار ہوکر مجاہدین کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ ان دنوں لکھنو میں جنگ آزادی کے سارے رہنما جمع تھے۔ انقلابی لیڈر نانا صاحب، ان کے وزیر عظیم اللہ خان، جنرل بخت خان جو سقوط دہلی کے بعد وہاں سے نکل کر روہیل کھنڈ اور وسط ہند میں مصروف جنگ تھے۔ مولانا سرفراز علی، مولانا فیض احمد، ڈاکٹر وزیر خان، نواب تفضل حسین فرخ آبادی، شہزادہ فروز شاہ، مولوی لیاقت علی اور مولانا احمد اللہ شاہ۔ اس دس روزہ جنگ میں ہڈسن جس نے دہلی میں مغل شہزادوں کو قتل کیا تھا، گولی کا نشانہ بن کر واصل جہنم ہوا۔ جب انگریزی فوجوں نے قلعہ میں داخل ہوکر لکھنو پر قبضہ کرلیا تو بیگم حضرت محل برجیس قدر کو لیکر لکھنو سے باہر چلی گئیں۔ سقوط لکھنو کے بعد سارے اودھ میں مجاہدین ایک سال تک گوریلا جنگ کرتے رہے۔ اس گوریلا جنگ کے رہنما تانتیا ٹوپے، مولانا احمد اللہ شاہ، شہزادہ فیروز شاہ اور بیگم حضرت محل تھیں۔

کان پور:

۴رجون ۱۸۵۷ء کو کان پور کی ہندوستانی رجمنٹ نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار

اٹھا لیے۔ صوبہ دار شمس الدین خان اور ٹیکہ سنگھ کی رہنمائی میں نواب گنج کی طرف مارچ کیا جہاں نانا صاحب کی فوجی چھاؤنی تھی۔ کان پور کے عوام نے مولانا سلامت اللہ کی رہنمائی میں آزادی کا پرچم لہرایا۔ عوام اور سپاہیوں نے ملکر نانا صاحب کو فوجی سلامی دی۔ اور نانا صاحب کی آزاد حکومت کا اعلان کیا۔ ملکی اور فوجی انتظامات عظیم اللہ خان نے سنبھال لئے۔ مولانا سلامت اللہ کو مجاہدین کا سالار مقرر کیا گیا۔ ۲۳؍جون ۱۸۵۷ء کو جو جنگِ پلاسی کا سوسالہ دن تھا انقلابیوں نے انگریز فوجی چھاؤنی پر حملہ کر دیا۔ نانا صاحب کی فوجی قوت سے ڈر کر انگریزی فوج نے صلح کی درخواست کی اور معاہدہ کر کے کانپور سے نکل گئی۔ ۲۸؍جون کو نانا صاحب نے دربار کیا۔ سب سے پہلے بہادر شاہ ظفر شہنشاہ ہند کی سلامی کے لئے ایک سو توپیں داغی گئیں۔ اور پہلی جولائی کو نانا صاحب شہنشاہ ہند کی طرف سے کان پور کے حاکم مقرر ہوئے۔ اور رسم تاج پوشی منائی گئی۔

بنارس، الہ آباد اور فتح پور کے مجاہدین کا قتل عام کر کے انگریزی فوجیں جنرل ہیولاک کی سرکردگی میں کان پور کی طرف بڑھیں اور ایک خونریز جنگ کے بعد کانپور پر قبضہ کر لیا۔ نانا صاحب کان پور سے نکل کر اودھ چلے گئے۔

شاملی کی جنگ:

شاملی کا معرکہ جنگی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ انگریزوں کا ایک فوجی دستہ ہتھیار لیکر سہارن پور سے شاملی کی طرف جا رہا تھا۔ جب حاجی امداد اللہ کو اس کا پتہ چلا تو ان کے مجاہدین نے اس دستے پر حملہ کر کے اس کے ہتھیار چھین لئے اس کی اطلاع جب سہارن پور کے کلکٹر کو ملی تو وہ فوج لیکر شاملی کی طرف بڑھا۔ حاجی امداد اللہؒ نے شاملی پر حملہ کر دیا۔ ان کے مجاہدین میں ہندوستان کے وہ عالم تھے جنکے علم اور تقویٰ کی شہرت سارے عالم اسلام میں تھی۔ حضرت حافظ ضامن علیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ اس جنگ میں حافظ ضامن علی شہید ہوئے۔ ۲۸ حاجی امداد اللہؒ صاحب چشتی اور صابری طریقت کے

صوفی تھے اور اس دور کے عظیم علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ان کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ امداد اللہؒ صاحب شیخ العرب والعجم کے لقب سے ملقب تھے۔ اس حوالے سے ان کے علمی اور روحانی مدارج کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وسط ہند:

وسط ہند میں تین اہم فوجی مرکز تھے۔ اجمیر، نصیر آباد اور نیمچ۔ وسط ہند کا تقریباً سارا علاقہ براہ راست کمپنی کی عمل داری میں نہیں تھا۔ بلکہ زیادہ تر چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ میواڑ میں رانا سروپ سنگھ کی حکومت تھی، جے پور میں رام سنگھ کی۔ الور میں جنی سنگھ، جودھپور میں تخت سنگھ اور بیکانیر میں اسی خاندان کی ایک شاخ حکومت کر رہی تھی۔ ہاڑا راجپوت کوٹہ اور بوندی کی گدی پر تھے۔ ٹونک پنڈاری لیڈر امیر خان کے وارثوں کے زیر حکومت تھا۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کا خیال ہے کہ "اگر یہ راجپوت والیان ریاست دین کی آواز سن لیتے تو دہلی سے گجرات تک کے علاقے سے برطانوی اقتدار ختم ہو گیا ہوتا۔" ۲۹

وسط ہند کی جنگِ آزادی کے دو اہم ہیرو ہیں۔ مغل شہزادہ فیروز شاہ اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی۔ جھانسی کی رانی کا نام تاریخ کے صفحات پر زندہ ہے۔ لیکن فیروز شاہ کا نام تاریخ کے صفحات سے مٹا دیا گیا ہے۔ پنڈت نہرو نے ڈسکوری آف انڈیا میں جہاں جھانسی کی رانی کے بارے میں تفصیلی نوٹ لکھا ہے وہاں فیروز شاہ کے بارے میں صرف نام لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ ۳۰ البتہ خورشید مصطفیٰ رضوی صاحب نے ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کے حوالے سے یہ اقتباس دیا ہے۔

> "اس وقت سے (یعنی ۱۸۵۷ء) ایک صدی پہلے اُس جیسی صلاحیتوں کا مالک انسان یقیناً ایک عظیم الشان سلطنت فتح کرتا۔ اور اس دور سے ایک صدی بعد اگر وہ جنم لیتا تو آج کا ہر دل عزیز رہنما بنتا۔ اس طرح وہ یا تو اپنے وقت سے بہت بعد پیدا ہوا اور یا بہت پہلے...... سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ آج اس کے صرف چند ہم وطن اسے یاد رکھ سکے ہیں۔ ۳۱

ڈاکٹر سین جس شخصیت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں اس کا اصل نام فیروز بخت اور والد کا نام ناظم بخت تھا۔ ناظم بخت مغل بادشاہ فرخ سیر کے نواسے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں فیروز شاہ کی عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ جون ۱۸۵۵ء میں فیروز شاہ اسلامی ممالک کا دورہ کرنے کی خاطر دہلی سے روانہ ہوا۔ اور مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستان واپس آیا۔ بمبی پر اُترنے کے بعد جب اُسے پتہ چلا کہ ملک میں جنگ آزادی کا بگل بج چکا ہے تو وہ فوراً دہلی روانہ ہوا۔ شاید دہلی میں مغل شہزادے جو فوجوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ شہزادے فیروز شاہ کو وہاں ٹھہرنے نہیں دیا۔ چنانچہ ماہ جون میں وہ دہلی سے مندر سور آ گیا۔ اور انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ عوام کی بڑی تعداد شہزادے کے ساتھ ہوگئی جن میں زیادہ تر افغانی اور مکرانی تھے۔ شہر پر قبضہ کرنے کے بعد شہزادے کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا۔ جیران کے مقام پر فیروز شاہ نے انگریزی فوجوں کو زبردست شکست دی اور اندور سے ہوتا ہوا گوالیار پہنچ گیا۔

۴ر جون کو جھانسی کے عوام نے ہتھیار اٹھالیے ۷ر جون کو کالے خان رسالدار اور محمد حسین تحصیل دار کی رہنمائی میں انقلابی فوج نے انگریزوں کو جھانسی سے نکال دیا۔ اور لکشمی بائی کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ لکشمی بائی کی حکومت کے اعلان کے ساتھ انقلابیوں نے یہ نعرہ بھی ایجاد کیا۔ ”خلقت خدا کی ملک شہنشاہ کا اور حکومت لکشمی بائی کی“ یہ دراصل اعلان تھا کہ کمپنی بہادر کی حکومت ختم ہوئی اور اس کی جگہ اب حکومت ایک مقامی حکمران کی ہے جو شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کا نمائندہ ہے۔ ماہ جون ۱۸۵۷ء سے ماہ جنوری ۱۸۵۸ء تک جھانسی آزاد رہا۔ رفتہ رفتہ ملک کے دوسرے حصوں میں جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد جنوری ۱۸۵۸ء میں انگریز فوجیں وسطی علاقوں کی طرف بڑھیں۔ انگریزوں کے ساتھ اس علاقے کے اکثر رجواڑوں کی فوجیں بھی تھیں جنھوں نے قدم قدم پر انقلابیوں کو کچلنے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان ریاستوں میں بندیلہ، کچھ، گوالیار، اندور اور بھوپال وغیرہ شامل تھے۔

جون ۱۸۵۷ء سے جنوری ۱۸۵۸ء تک مہارانی جھانسی اور فیروز شاہ کی مشترکہ جنگی حکمت عملی سے وسط ہند انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں جب انگریزی فوجیں جھانسی کی طرف بڑھیں تو اس وقت فیروز شاہ اور نانا صاحب اودھ میں حضرت محل اور

برجیس قدر کے ساتھ گوریلا جنگ کو منظم کر رہے تھے۔ ۲راپریل ۱۸۵۸ء کو انگریزوں نے جھانسی پر قبضہ کرلیا۔ رانی لکشمی بائی جھانسی سے نکل کر گوالیار چلی گئی۔ یکم جون کو رانی نے انگریزوں کے دوست سندھیا کی فوج کو شکست دے کر گوالیار پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸رجون کو انگریزوں نے اپنے یاروفادار جیاجی راؤ سندھیا کا تخت واپس دلانے کے لئے گوالیار پر حملہ کر دیا۔ پہلے دن کی جنگ میں انگریز ناکام رہے۔ دوسرے دن یعنی ۱۹رجون ۱۸۵۸ء کو جنگِ آزادی کی آخری لڑائی گوالیار کے قلعے کے سامنے لڑی گئی۔ اس دن ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں جرات، ہمت، ایثار، وطن دوستی اور عظیم قربانی کا ایک صفحہ خون شہیداں کی سرخ سرخ روشنائی سے لکھا جانے والا تھا۔ اکیس سالہ رانی اس دن چندیری صافہ باندھے ہوئے تھی جس پر خادم گل محمد نے زردوزی کا نہایت نفیس کام کر کے اُسی دن کے لئے تیار کیا تھا۔ مردانہ لباس میں آزادی کی متوالی دشمن کی صفوں میں گھس رہی تھی۔ انگریزی فوج پیچھے ہٹ رہی تھی یہاں تک کہ رانی یلغار کرتی ہوئی اپنی فوج سے دور ہوگئی۔ پھر انگریزی فوج کا اونٹ سوار دستہ آگے بڑھا اور رانی کے باڈی گارڈ دستے اور فوج درمیاں آ گیا۔ رانی نے پلٹ کر اونٹ سوار دستے پر حملہ کر دیا تا کہ راستہ بنا کر اپنی فوج سے جا ملے اس وقت ساری توپیں خاموش ہو چکی تھیں اور فضا میں سناٹا تھا۔ لیکن طائران چمن چیخ رہے تھے کہ دیکھو کروکشیتر کا ایک منظر صدیوں کا فاصلہ پھلانگ کر گوالیار کے دروازہ پر آ پہنچا ہے۔ ابھیمنیو کی روح ایک بار پھر دغاباز دشمنوں کے گھیرے میں تھی۔ پھر رانی کے سر پر داہنی طرف تلوار کا ایک وار پڑا۔ ابروئے خم دار کو کاٹتا ہوا چشم بینا میں اُتر گیا پھر ایک زخم سینہ پر لگا۔ جوئے حیات ابل پڑا۔ جواب میں صافے نے اپنا منہ کھول دیا اور جعد مشکیں کے چلمن نے قلب سعید کو ڈھانپ لیا۔ ہندوستان کی سرزمین خون مانگ رہی تھی۔ زمین اُس وقت خون کی مانگ کرتی ہے جب آبا و اجداد کی غفلت اور بے حسی سے اس کی حرمت پامال ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ حال سے خون مانگ کر مستقبل کو بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ اگر حال نے وقت پر خون کی قربانی نہیں پیش کی تو سرزمین آنے والی نسلوں کو تلپٹ کر دیتی ہے۔ ہندوستان کی وطن دوست روحیں حسِ باطنی سے مالا مال تھیں سو انہوں نے وقت کی مانگ پر لبیک کہا اور اپنا خون پیش کیا۔ سو سال پہلے بھاگیرتی ندی کے کنارے سراج الدولہ

نے اپنا خون دیا۔ ۵۰ سال قبل کاویری کی جوشیلی لہروں کے سامنے سلطان شہید نے مسکراتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ ۲۵ سال پہلے بالاکوٹ کی بلندیوں پر سید احمد اور شاہ اسماعیل سلطان شہید کے نقش قدم پر چل کر جنت نشیں ہو گئے۔ اور آج رانی لکشمی بائی نے گوالیار کی سرزمین پر اپنا خون بہا کر شکست فاتحانہ کے علامتی ادعا کو عملی شکل دے دی۔

سردار لکشمی بائی آخری سانس لے رہی تھی۔ اُسی خادم گل محمد نے جس نے سردار کے سر کی زینت کے لئے صافہ پر زردوزی کام کیا تھا رانی کے گھوڑے کی لگام تھام لی اور اسے بھگاتا ہوا ایک سنت کی کٹیا میں لے گیا اور رانی کو گھوڑے سے اُتار کر سنت کے پھوس کے بستر پر لیٹا دیا۔ رانی نے آخری بار اپنی زبان کھولی اور خادم سے چند الفاظ کہہ کر دم توڑ دیا۔ رانی کی آخری خواہش کے مطابق گل محمد نے کٹیا کے سامنے گھاس پھوس کی چتا بنا کر آخری رسمیں ادا کیں اور چتا کو آگ لگا دی تاکہ رانی کے پوتر اور پاک جسم پر ناپاک دشمن کی نگاہیں تک نہ پڑ سکیں۔[۳۲]

جنگ آزادی: ناکامی کے اسباب:

پچھلے صفحات میں ہم نے واضح کیا تھا کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا راج ہندوستان میں بحال کرنا ہو تو اسے سب سے پہلے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ جنگِ آزادی کی شروعات دہلی سے بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کے اعلان سے ہوئی تھی۔ یعنی جنگ پلاسی کے ایک سو سال بعد مجاہدین نے کمپنی کے اقتدار کو ختم کر کے مغل اقتدار کی بحالی کا اعلان کیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو انقلابیوں کی کمزور اور منتشر عسکری قوت کا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو جے پور، جودھپور، الور، اور بیکانیر کے راجاؤں کو خطوط لکھے۔ ان خطوط اور اس کے جواب میں ان راجوں کے رویے سے جنگ آزادی میں ناکامی کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔

بہادر شاہ لکھتے ہیں[۳۳]

"میری دلی خواہش ہے کہ فرنگی جس طرح سے بھی ہو ہر قیمت پر ہندوستان سے نکال دیئے جائیں اور ملک آزاد ہو۔ لیکن آزادی کی جنگ اس وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب ایک قابل شخص جو تحریک کا تمام بار اپنے کاندھوں پر لے کر منتشر

قوتوں کو منظم کر سکے اور اس بغاوت (یعنی جنگ آزادی) کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھے۔ میں ذاتی طور پر حکومت کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ اگر تم دیسی راجگان اپنی تلوار دشمن کو نکالنے کے لئے بے نیام کرنے کو تیار ہوں تو میں ان کے حق میں شہنشاہی سے مستعفی ہو جاؤں گا جو اس کام کے لئے منتخب ہوں"

(غدر کی صبح و شام خواجہ حسن نظامی صفحہ ۲۲۲)

ان خطوط کا حوالہ دے کر خورشید مصطفیٰ رضوی صاحب لکھتے ہیں: "مگر ان رجواڑوں کو ملک کی غلامی کا احساس نہ تھا۔ ستم تو یہ ہے وہ غیر جانب دار بھی نہ تھے بلکہ انگریزوں پر روپیہ اور فوج کی بارش کر رہے تھے۔ دھول پور کے راجہ نے پندرہ سو پیدل، کچھ سوار اور چھ توپیں بھیجیں، بیکانیر نے ۳ ہزار راجپوت بھرتی کر کے بھیجے۔ راجہ نالی گڈھ نے ایک ہزار گورکھے روانہ کئے۔ جموں کا راجہ بھی فوج بھیج رہا تھا۔"[۳۳] یہ ہندوستانی سپاہی تھے جنھیں مقامی رجواڑے انگریزوں کی مدد کے لئے دہلی بھیج رہے تھے۔ ان کے علاوہ ۱۱ر جون کو گوالیار کی فوج کا ایک دستہ دہلی میں مجاہدین سے کٹ کر انگریزوں سے جا ملا۔ ۲۸ر جون کو کرنل گریٹ ہیڈ (Great Hed) سکھ رجمنٹ کو لے کر دہلی کے محاذ پر پہنچا۔ ۹ر جولائی کو آرٹلری رجمنٹ کے ۳ سو سپاہی انگریزوں کی مدد کے لئے دہلی کے محاذ پر پہنچ گئے۔ ۱۸ر جولائی کو سکھ کیولری کی ایک بڑی تعداد گولہ بارود اور سامان رسد لے کر دہلی کے محاذ پر پہنچ گئی۔ ۱۴ر اگست کو نکلسن (Nicholson) ڈھائی ہزار فوج، بھاری توپیں اور اسلحہ بارود کا ذخیرہ لے کر انگریزی فوج کی مدد کے لئے دہلی پہنچ جاتا ہے۔ ار ستمبر کو مہاراجہ کشمیر اور میرٹھ کی فوجیں انگریزوں کی مدد کے لئے دہلی پہنچ جاتی ہیں۔ ۷ر ستمبر کو مہاراجہ کشمیر مزید ۳ ہزار ڈوگرا سپاہی انگریزوں کی مدد کے لئے دہلی روانہ کرتے ہیں[۳۴] غرض ۷ر ستمبر تک تمام نئی تازہ دم اور مسلح انگریزوں اور ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل فوجی دستے دہلی کے محاذ پر جمع ہو گئے اور مورچے بنانے شروع کر دئے۔ ادھر انقلابی کیمپ میں کوئی ایسا افسر نہ تھا جو تمام فوجوں کو اکٹھا کر کے ان کی کمان کرتا۔ افراتفری اور انارکی کا عالم تھا۔ فوجی اخراجات کے لئے تقریباً ۸ لاکھ کے سرمایے کی ضرورت تھی۔ دہلی کے سرمایہ داروں نے ۴ یا ۵ لاکھ کی رقم جمع کروائی تھی لیکن وہ

رقم ان شہزادوں کے جیب میں چلی گئی جو فوج کے سربراہ مقرر کئے گئے تھے۔ان شہزادوں اور جنرل بخت خان میں شدید اختلافات تھے۔چنانچہ صورت حال یہ تھی کہ انقلابی فوج میں ایک مضبوط اور مقتدر فوجی رہنما یعنی سپریم کمانڈر کی کمی تھی ۔ دوسرے درجہ کے جو فوجی رہنما تھے وہ ناتجربہ کار اور غیر تربیت یافتہ تھے۔فوج کا بیشتر حصہ بھی غیر تربیت یافتہ عوام پر مشتمل تھا۔اور جو تربیت یافتہ فوجی تھے وہ انگریزی فوج کے دیسی سپاہی تھے جن کے پاس جدید ہتھیار نہ ہونے کے برابر تھے۔اور اُدھر نظم وضبط اور تجربے کے لحاظ سے،جنگی ساز و سامان، مالیہ اور جدید ہتھیاروں کے لحاظ سے اور ایک مضبوط ماہر جنگ مرکزی لیڈر شپ کے لحاظ سے انگریزی فوج بہت برتر تھی۔اور ساتھ ہی پنجاب کے بہادر اور تربیت یافتہ سکھ، کشمیر کے ڈوگرا حکمران، وسط ہند کے راجپوت والیانِ ریاست،شمال میں نواب رام پور، گوالیار کے سندھیا اور دکن کی مملکت آصفیہ انگریزوں کی مدد روپیہ اور فوج سے کر رہے تھے۔اور طرفہ تماشہ یہ کہ دہلی میں غداروں کی ٹولی سرگرم عمل تھی جو انقلابی فوج کے حالات اور حکمت عملی کی اطلاع انگریزوں کو فراہم کر رہی تھی۔اس ٹولی کے کچھ لوگ انقلابی فوج کو عملی طور پر نقصان بھی پہنچا رہے تھے۔چنانچہ ۲۶ رمئی کو سلیم گڑھ کے قلعے پر نصب کی گئی توپوں میں کسی نے پتھر بھر کر انھیں ناکارہ کر دیا۔شبہ تھا کہ یہ کام حکیم احسن اللہ خان، محبوب علی خان اور ملکہ زینت محل نے مل کر انگریزوں کی ایما پر کیا تھا۔۲۹ رمئی کو حکیم احسن اللہ خان نے انقلابی فوج کے پانچ سو سواروں کو خواہ مخواہ میرٹھ جا کر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ انگریزوں کا ایک فوجی دستہ دریائے ہندو کے پل پر ان سپاہیوں کا انتظار کر رہا تھا۔اچانک حملہ کر کے انگریزوں نے ان پانچ سو سواروں کا خاتمہ کر دیا۔ ۸ راگست کو دہلی میں انقلابی فوج کے بارود کے کارخانے کو تباہ کر دیا گیا۔بارود کے کارخانے کے داروغہ رجب علی نے انگریز دوستی میں اس مکروہ کام کو انجام دیا تھا۔

ان نامساعد حالات کے باوجود انقلابی فوج،اس کے رہنما اور خاص طور پر علماء نے وطن اور ملک کو آزاد کرانے کے لئے جو قربانیاں دی ہیں وہ ہماری تاریخ کا ایک قابل فخر باب ہے۔ غداروں کی ٹولی کے منافقانہ مذموم حرکتوں کے باوجود مجاہدین نے دہلی کو آسانی سے انگریزوں

کے حوالے نہیں کیا۔ ۱۴ ستمبر کی صبح ۷ بجے انگریزی فوج نے دہلی پر یلغار کی۔ ۱۵ ستمبر کو انگریزی فوجیں تین اطراف سے دہلی میں داخل ہوئیں اور ۴ دن کی گھمسان لڑائی کے بعد ۱۹ ستمبر کو شہر، قلعہ اور شاہی محل پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ شہر اور قلعہ میں موجود زخمی سپاہیوں کا ہوڈسن کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل عام ہوا۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ ابھی دہلی پوری طرح سے فتح نہ ہوئی تھی اور نہ مغل اقتدار کی شمع گل ہوئی تھی۔ ابھی آزادی حاصل کرنے کے امکانات تھے کیونکہ سارے ہندوستان نے مغل اقتدار اور آزادی کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا تھا۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہم جنرل بخت خان اور بہادر شاہ کی گفتگو کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ۱۹ ستمبر کی رات کو جنرل بخت خان بہادر شاہ کے پاس آئے، ان کو ہمت دلائی اور کہا۔ ۳۵

اگر چہ کہ انگریزوں نے دہلی کو لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ تمام ملک ہمارے ساتھ ہے۔ ہر شخص کی نظر آپ کی ذات پر لگی ہوئی ہے۔ آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔ میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ایسی مورچہ بندی کروں گا کہ انگریزوں کا فرشتہ بھی نہ آسکے گا۔ دہلی پایۂ تخت ہے۔ فوجی قلعہ نہیں ہے۔ لڑائیوں کے لئے ایسے مقامات مناسب نہیں ہوتے۔ چند مہینے جو ہم نے مقابلہ کیا ہے یہ بھی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارا شہر نشیب میں تھا۔ اور انگریز پہاڑی پر۔ کوئی نا تجربہ کار فوج بھی پہاڑی جیسے مضبوط مورچے پر ہوتی تو فتح دشوار نہ تھی۔ پھر سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ حضور کے صاحب زادے مرزا مغل کمانڈر انچیف بنا دیئے گئے۔ وہ لڑائی کے فن سے ناواقف تھے۔ اگر وہ میرے کاموں میں رخنہ نہ ڈالتے اور میرے منصوبوں میں حارج نہ ہوتے تو یقیناً اسی خودسر فوج سے دشمن کو شکست دیتا۔ ہم کو آپس کے بگاڑ اور ایک دوسرے پر بھروسہ نہ کرنے کے سبب وہ قوتیں جو دشمن کے مقابلے میں صرف ہوتیں، خانگی جھگڑوں میں بے کار ضائع کرنا پڑیں مگر اب بھی کچھ نہیں گیا۔.......... تمام ہندوستانی ریاستیں چپ چاپ بیٹھی ہیں جس وقت ہمارا پلہ ذرا بھی بھاری ہوگا وہ

ہماری مدد کے لئے اٹھ کھڑی ہوں گی............آپ یقین کیجئے کہ اگر آپ محفوظ مقامات سے انگریزوں کا مقابلہ کریں گے تو تمام ملک ساتھ دے گا۔ آدمی، رسد، ہتھیار اور روپیہ ہم کو اس افراط سے مل سکتے ہیں کہ انگریز اپنے ملک کے بچے بچے کو ہم پر چڑھا لائیں تب بھی ہم صدیوں تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جہاں پناہ کے سامنے یہ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے کہ حضور کے باپ دادا نے اس سے بڑھ بڑھ کر شکستوں اور ناکامیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ (دہلی کی جانکنی: خواجہ حسن نظامی: صفحہ ۴۷-۴۸)

بہادر شاہ بخت خان کی گفتگو سے متاثر ہوئے اور اگلے دن ہمایوں کے مقبرے میں اُن سے ملاقات کرنے کو کہا۔ انگریزوں نے مرزا الٰہی بخش کو بہادر شاہ پر مسلط کر دیا تھا۔ الٰہی بخش منشی رجب علی کے ذریعہ تمام خبریں انگریزی کیمپ پہنچا رہا تھا۔ بخت خان کی گفتگو کے بعد وہ بہادر شاہ کے پاس آیا۔ بڑھاپے کا احساس دلایا۔ برسات کے موسم کی تکالیف کا ذکر کیا۔ شہزادوں، شہزادیوں اور بیگمات کی تکلیفوں کا نقشہ کھینچا۔ انگریزوں سے گفتگو کر کے شاہی خاندان کی حفاظت اور جان بخشی کی ذمہ داری لی۔ بہادر شاہ یہ باتیں سن کر خاموش ہو گئے کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ الٰہی بخش نے ساری باتوں کی اطلاع انگریزوں کو دے دی۔ اُس کو حکم ملا کہ ۲۴ گھنٹے بادشاہ کو روکے رکھے باہر جانے نہ دے۔ دوسرے دن بخت خان بہادر شاہ سے ملے بہت دیر بحث و تکرار رہی۔ بہادر شاہ جانا چاہتے تھے۔ مگر الٰہی بخش انھیں روک رہا تھا۔ بخت خان نے جب اصرار کیا تو الٰہی بخش نے نہایت تلخ انداز سے کہا۔ "لارڈ گورنر صاحب! کل آپ نے فرمایا تھا کہ میں حضور کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھوں گا تو کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جہاں پناہ کی آڑ میں آپ خود حکومت کرنا چاہتے ہیں............آپ مغلوں سے صدیوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں............میں جانتا ہوں آپ پٹھان ہیں اور پٹھان سیکڑوں برس تک کینے کو نہیں بھولتے۔" یہ بے ہودہ گفتگو سن کر بخت خان نے اپنی تلوار پر ہاتھ ڈالا اور قریب تھا کہ اس کا سر اُڑا دیں مگر بادشاہ نے روک دیا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو بخت خان مایوس ہو کر چلے گئے۔ الٰہی بخش نے انگریزوں کو اطلاع دے دی۔ دوسرے دن ہڈسن بہادر شاہ کو گرفتار کرنے

کے لئے ہمایوں کے مقبرے میں پہنچ گیا۔ ۲۱ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے جان بخشی کے وعدہ پر خود کو ہڈسن کے حوالے کر دیا۔ اور ساتھ ہی مغل اقتدار کا چراغ گل ہو گیا۔ اور حکومت کی باگ ڈور مسلمان حکمران کے ہاتھ سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ۳۶

اس وقت جنگ کے شعلے سارے ہندوستان میں بھڑک رہے تھے۔ خاص طور پر روہیل کھنڈ، اُودھ، اور وسط ہند میں سارے انقلابی لیڈر بہادر شاہ ظفر کو حاکم اعلیٰ مان کر میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ایسے میں اگر بہادر شاہ شاہی خاندان اور جنرل بخت خان کو لیکر روہیل کھنڈ یا وسط ہند کے پہاڑی علاقے میں پہنچ جاتے تو اس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ جنگ کی کیا صورت ہوتی۔ عین ممکن ہے کہ وہ سب کچھ جنرل بخت خان کے ہاتھوں ہو جاتا جس کا اظہار انھوں نے ۱۹ر ستمبر کی شام بہادر شاہ سے گفتگو کے دوران کیا تھا۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا درد ہے جس کے اظہار کے لئے ایک الگ اور مختلف نوعیت کے تجزیہ کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ جہاں ہزاروں افراد نے آزادی وطن کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی دی وہیں سیکڑوں ایسے غدار بھی پیدا ہوئے جو دولت اور اقتدار کی ہوس میں دشمنوں سے ساز باز کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کیا۔ الہی بخش انھیں میں کا ایک سیاہ باطن کردار ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے غاصبانہ اقتدار اور ظلم وستم کا مقابلہ کرنے کے لئے جن لوگوں نے تلوار اُٹھائی ان میں جہاں سراج الدولہ، حیدر علی، ٹیپو سلطان، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، سید احمد اللہ شاہ، جنرل بخت خان، نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، شہزادہ فیروز شاہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولوی عظیم اللہ خان، علی نقی خان، بیگم حضرت محل اور رانی جھانسی جیسے جانباز موجود تھے وہاں ہر دور میں غداروں کا ایسا طائفہ بھی موجود رہا جو آستین کے سانپ کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگر غداروں کی جماعت ایک طرف براہ راست انگریزوں کی عسکری مدد اور دوسری طرف شاہی دربار اور مجاہدین کا اعتماد حاصل کر کے ان کی جنگی مشاورتی کونسل میں شامل ہو کر ان کے منصوبوں کی اطلاع انگریزوں کو فراہم نہ کرتی تو اس جنگ کا نقشہ شاید کچھ اور ہی ہوتا۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ اپنی عسکری قوت کی برتری کی بنا پر نہیں کیا بلکہ سازشوں اور جاسوسی کے بہتر نظام کے بل پر کیا تھا۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی کامیابی میں چند بااثر اور بہتر عسکری قوت والے دیسی والیان ریاست کی مدد اور غداروں کی ٹولی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ والیانِ ریاستوں میں پنجاب کی ریاستیں، کشمیر کے ڈوگرا حکمران گلاب سنگھ ابتداء ہی سے انگریزوں کی مدد کرتے رہے بعض نے انگریزوں کا پلڑا ابھاری ہونے کے بعد ان کا ساتھ دیا جیسے جیاجی راؤ سندھا، نواب رام پور، وسط ہند کے رجواڑے اور حیدر آباد دکن کے نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ۔ متعدد انگریز مورخوں نے اعتراف کیا ہے کہ اگر پنجاب، وسط ہند، گوالیار اور دکن انگریزوں کا ساتھ نہ دیتے تو کمپنی بہادر کی حکومت ۱۸۵۷ء میں ختم ہو جاتی۔

غداروں کی ٹولی اور اس کے شرمناک جاسوسی کارناموں کے بارے میں ایک اہم کتاب ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ جناب سلیم قریشی اور مشہور شاعر عاشور کاظمی صاحبان نے انڈیا آفس لائبریری سے غداروں کے خطوط جمع کرکے "گھر کو آگ لگ گئی" کے عنوان سے کتاب شائع کی ہے جس سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کا نیا زاویہ نظر سامنے آتا ہے۔ اس کے ایک اقتباس سے غداروں کے شرمناک کارناموں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ "میر صادق، میر غلام علی، قاسم علی اور دیوان پورنیا جیسے غدار نہ ہوتے تو ناممکن نہ تھا کہ ٹیپو سلطان ہی اپنی فوجی طاقت اور حکمت عملی کے بل پر پوری انگریزی فوج کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو فتح اپنی طاقت کے بل پر نہیں بلکہ مرزا الٰہی بخش، مولوی رجب علی، گوری شنکر، جیون لال، تراب علی، مان سنگھ، لطافت علی، جواہر سنگھ، امی چند، میر محمد علی، محبوب خان، ہرچند، پربھو، میگھ راج، رستم علی، راجن گوجر، وغیرہ کی جاسوسی اور وطن دشمنی کی وجہ سے ہوئی۔" ۳۷

عاشور کاظمی صاحب نے سر جان ولیم کے Sir gohn william kaye کی کتاب Sepoy War in India سے ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو ناکام بنانے میں غداروں کے رول کا اعتراف کرتے ہوئے جان ولیم نے لکھا ہے۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہماری بحالی کا سہرا ہمارے ہندوستانی

پیروکاروں کے سر ہے جن کی ہمت و جسارت نے ہندوستان کو اپنے ہم وطنوں سے لے کر ہمارے حوالے کر دیا۔"[38]

"اس گھر کو آگ لگ گئی" میں ۱۴۷ خطوط درج کئے گئے ہیں ہم صرف چند منتخب خطوط سے اقتباسات پیش کر کے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔[39]

۱۔ لطافت علی (سوار پہلی ریگولر رجمنٹ) ۱۸ / جون ۱۸۵۷ء

میں ۱۸ / جون کو دہلی پہنچا اور سرائے روہیلہ خان سے ہوتا ہوا کشن گنج آیا۔ اس کے بعد لاہوری دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ باغی سپاہی (انگریزوں کے باغی یعنی مجاہدین) اس دروازے سے نکل کر انگریزی فوج پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ شاہی قلعہ کے دروازے پر ۵۴ ویں رجمنٹ پہرہ دے رہی تھی۔ یہاں سے میں کشمیری دروازہ گیا یہاں پر ۵۰۰ سپاہی دو توپوں سمیت پہرہ دے رہے تھے۔ اس کے بعد میں انگریزوں کے ایک ہمدرد دوست سید حامد علی خان سے ملنے گیا۔ حامد علی خان نے بتایا کہ دہلی پر حملہ کے دوران وہ خود ملکہ زینت محل اور اعظم علی خان اپنی اپنی فوجوں کو لیکر باغی فوجوں کی مدد کے بہانے شہر سے نکل آئیں گے اور موقعہ ملتے ہی انگریزی فوجوں سے آملیں گے۔ باغی فوج یہ دیکھ کر فرار ہو جائے گی۔

۲۔ ایک نامعلوم جاسوس: ۱۸ / جون ۱۸۵۷ء

باغیوں نے سب سے بھاری توپ کو سلیم گڑھ کے قلعہ پر نصب کر دیا ہے۔ شہزادہ مغل اور شہزادہ ابوبکر انگریزی فوج کو پانی پت کے راستے سے آنے والی کمک کو راستے میں لوٹنے کا پلان بنا رہے ہیں۔ باغی فوج میں اس وقت ۱۳ ہزار سپاہی اور ایک ہزار تین سو سوار ہیں۔ ان میں تقریباً ۳ ہزار مسلح سپاہی ہیں۔

۳۔ جواہر سنگھ ۲۰ / جون ۱۸۵۷ء

جواہر سنگھ مخبری کے لئے ۱۹ / جون کو انگریزی کیمپ سے دہلی پہنچا۔ اس نے مندرجہ ذیل اطلاعات دیں۔ میں نے باغی فوج کے پانچ ہزار اور سات ہزار کے درمیان سپاہیوں کو انگریزی کیمپ پر حملہ کرنے کے لئے شہر سے باہر جاتے دیکھا۔ میں نے

بعض باغیوں کو آپس میں گفتگو کرتے سنا جو کہہ رہے تھے کہ انھیں چاہیے کہ انگریزی کیمپ پر عقب سے اور سامنے سے دوبارہ پوری قوت کے ساتھ جم کر حملہ کرنا چاہیے تا کہ یا تو وہ انگریزی فوج پر فتح پالیں یا لڑتے ہوئے شہید ہو جائیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ جالندھر کی فوج آنے کے بعد انگریزی فوج کو باغپت اور سونی پت سے آنے والی کمک کو راستے میں روک کر تباہ کر دینا چاہیے۔

۴۔ میر محمد علی (نویں ریگولر کیولری: انگریزی فوج کا جاسوس) ار جولائی ۱۸۵۷ء

میں ۱۹ر جون کو لاہوری دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ یہاں پر افواہ ہے کہ روہیلکھنڈ سے پانچ رجمنٹیں، ایک رسالہ اٹھویں اریگولر کا اور ایک توپ خانہ دہلی پہنچنے والا ہے۔ ان کے ساتھ سامان سے لدے ایک ہزار چھکڑے بھی ہیں اور یہ فوج اپنے ساتھ نو لاکھ کا خزانہ بھی لا رہی ہے۔ دہلی دروازے کے باہر پرانے قلعے میں ہر قسم کی فوج جمع ہے لیکن ان کی تفصیل نہیں مل سکی۔ باغیوں کی کل تعداد بیس ہزار ہے اور ان میں سے ہر شخص لڑائی میں جان دینے کو تیار ہے۔

۵۔ ہر چند گوسائیں: ۳۰ جولائی ۱۸۵۷ء

اجمیری دروازے کے قریب ایک توپ نصب ہے۔ روہیلکھنڈ سے آئی ہوئی فوج دہلی دروازے کے قریب مقیم ہے۔ یہ فوج مندرجہ ذیل حصوں میں منقسم ہے۔ انفنٹری پانچ رجمنٹ۔ کیولری ایک رجمنٹ۔ توپیں ۹ عدد۔ ۹ لاکھ کا خزانہ۔ اٹھ سو گھوڑے ان کے ساتھ چار سو غازی بھی ہیں۔ گوالیار فوج کا ایک وردی میجر ۲۵ سواروں کے ساتھ آج دہلی پہنچا ہے اور اس نے دربار میں حاضری دی۔ بادشاہ نے آج فوج کی مختلف رجمنٹوں میں ۳۲ جھنڈے تقسیم کیے۔ باغی فوج نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا ایک حصہ دہلی میں رہے اور بقیہ تمام فوج شہر سے نکل کر انگریزی مورچوں پر حملہ آور ہو۔ شہر میں کھانے پینے کی اشیاء کے نرخ مندرجہ ذیل ہیں:

آٹا ایک روپیہ میں ۲۲ سیر، گندم ایک روپیہ میں ۳۹ سیر، گھی ایک روپیہ میں ۲ سیر، شکر ایک روپیہ میں ۷ سیر، اور گڑ ایک روپیہ میں ۹ سیر۔

۶۔ رجب علی: ۲۹؍جولائی ۱۸۵۷ء

۴۷ویں اور ۵۴ویں رجمنٹوں کے پاس پانچ سو من بارود کا ایک علیحدہ ذخیرہ موجود ہے جو وہ کسی دوسری رجمنٹ کو دینا نہیں چاہتے ہیں۔ یہاں پر تقریباً چار سو من کچا گندھک موجود ہے۔ لیکن صاف کیئے ہوئے گندھک کا کوئی ذخیرہ شہر میں موجود نہیں ہے۔ میں نے بادشاہ سلامت کو مشورہ دیا تھا کہ ان کو چاہیے خفیہ طور پر شہر کا دروازہ کھلوا کر انگریزی فوج کو شہر میں داخل ہونے کا بندوبست کریں۔ اس طرح ان کی جان تو شاید بچ نہ سکے لیکن اس احسان کے بدلے انگریز ان کے ورثا سے اچھا سلوک کریں گے۔ بادشاہ سلامت تو راضی ہو جاتے لیکن حکیم احسن اللہ خان نے دخل اندازی کر کے معاملہ خراب کر دیا۔

۷۔ تراب علی: ۷؍اگست ۱۸۵۷ء

مرزا الٰہی بخش نے جو بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخر الدین کے سسر اور دربار کے عقلمند ترین امراء میں سے ہیں اور جن کا باشاہ سلامت اور ملکہ پر بڑا اثر رسوخ ہے گریٹ ہیڈ کو خط لکھا ہے جس میں گریٹ ہیڈ کو یقین دلایا ہے کہ وہ انگریزی حکومت کی بحالی کے لئے ہر قسم کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔

۸۔ تراب علی: ۳۰؍اگست ۱۸۵۷ء

حکیم احسن اللہ خان، مفتی صدر الدین، مرزا الٰہی بخش اور ملکۂ عالیہ بیگم زینت محل سب اپنی اپنی اہلیت کے مطابق انگریزی حکومت کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر آپ مرزا الٰہی بخش کو اس خط کا جواب دیں تو اس مقصد کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے گا۔ اور مولوی فضل حق اور دوسرے باغیوں کو شہر سے باہر نکال دے گا۔

۹۔ گوری شنکر: ۶؍ستمبر ۱۸۵۷ء

کل ایک پلٹن ۵۰۰ سواروں اور دو توپیں کے ساتھ ولی داد خان کی مدد کے لئے مالا گڈھ روانہ ہوئی۔ یہ مشہور کیا گیا ہے کہ یہ ہنڈوؤں (ایک مقام کا نام) میں جا کر مورچہ قائم کرے گی لیکن دراصل یہ مالا گڑھ اور شام گڑھ کے نزدیک شاہدرہ کی طرف گئی

ہے۔ وہاں پر پہلے ہی ایک مورچہ تھا۔ اب اس کو دوگنا کر دیا گیا ہے۔ اور فوج کی تعداد بھی بڑھادی گئی ہے.......... اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کسی فوج کے روانہ ہونے سے پہلے اس کی منزل کے متعلق غلط افواہیں اڑادی جائیں گی۔ اگر فوج مشرق کی طرف جانے والی ہو تو یہ اڑادیا جائے گا کہ وہ مغرب کی طرف جارہی ہے۔ تاکہ دشمن کو فوج کی حرکات کا صحیح علم نہ ہو۔ یہاں یہ اطلاع ہے کہ انگریزوں نے گڑگاؤں میں مورچہ قائم کرلیا ہے اور وہاں کے انتظام کے لئے ایک افسر کو مقرر کیا ہے ان لوگوں کا ارادہ وہاں فوج بھیجنے کا ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں جنون شوق کے شاعر شکیب جلالی نے جو نظم کہی ہے وہ خونِ دل میں ڈوب کر لکھی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ (فاروقی)

لہو ترنگ

شکیب جلالی

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کی یاد میں!

﴿پہلی آواز﴾

ہمیں قبول نہیں زندگی اسیری کی
ہم آج طوق وسلاسل کو توڑ ڈالیں گے
ہمارے دیس پہ اغیار حکمراں کیوں ہوں
ہم اپنے ہاتھ میں لوح وقلم سنبھالیں گے
فضا مہیب سہی، مرحلے کٹھن ہی سہی
سفینہ حلقۂ طوفاں سے ہم نکالیں گے
نقوشِ راہ اگر تیرگی میں ڈوب گئے
ہم اپنے خوں سے ہزاروں دیے جلالیں گے

دوسری آواز

جو لوگ لے کے اٹھے ہیں علم بغاوت کا
انہیں خود اپنی ہلاکت پہ نوحہ خواں کردو
بجھاؤ گرم سلاخوں کو ان کی آنکھوں میں
زبانیں کھینچ لو گدی سے، بے زباں کردو
ہدف بناؤ دلوں کو سلگتے تیروں کا
سناں سے جسموں کو چھیدو، شکستہ جاں کردو
محل سرا کی حدوں تک کوئی پہنچ نہ سکے
ہر ایک گام پہ استادہ سولیا کردو

پہلی آواز

یہ غم نہیں کہ سرِ دار آئے جاتے ہیں
ہمیں خوشی ہے، وطن کو جگائے جاتے ہیں
ہمارے بعد سہی رات ڈھل تو جائے گی
دلوں میں شمعِ جنوں تو جلائے جاتے ہیں
ہمارے نقش قدم دیں گے منزلوں کا سراغ
ہمیں شکست نہ ہوگی، بتائے جاتے ہیں
جواں رہیں گی ہمارے لہو کی تحریریں
سدا بہار شگوفے کھلائے جاتے ہیں

حوالہ جات

۱۔ جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: خورشید مصطفےٰ رضوی صفحہ ۴، مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی اول اپریل ۱۹۵۹ء (ناشر مکتبہ بُرہان اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ ۶)

۲۔ ایضاً۔ صفحہ ۹

۳۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۱، اور ۱۲

4- The Indian War of Independence of 1857 By V.D Savarkar Printed in the book, 'India in 1857' Edited by Ainslie T. Embree: P: 83 to 93, Chanakya Publications F-10/14 Model Town, Delhi-110009- 1987

۵۔ زوال حیدرآباد: سید حسین: صفحہ ۲۵، مطبوعہ (ناشر) سنٹر فار مینار یٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن نارائن گوڑہ، حیدرآباد۔ ۲۹، ستمبر ۲۰۰۱ء

۶۔ تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) صفحہ ۱۰۲، مطبوعہ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی: طبع اول ۱۹۹۰ء

۷۔ جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: خورشید مصطفےٰ رضوی، صفحہ ۸۱، مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی طبع اول اپریل ۱۹۵۹ء (ناشر مکتبہ بُرہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔ ۶)

۸۔ تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی عدیل عباسی) صفحہ ۲۲۹، ۲۳۵، اور ۳۶۰ مطبوعہ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی طبع اول ۱۹۹۰ء

۹۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل: پانچواں ایڈیشن، سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) صفحہ ۱۴۹: ناشر محمد سمیع اللہ قاسمی، کتب خانہ عزیزیہ دہلی مطبع علیمی دہلی: ۱۹۴۵ء

۱۰۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۶۷

۱۱۔ تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) صفحہ ۲۶۱، مطبوعہ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی طبع اول ۱۹۹۰ء

۱۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان: ڈبلیوڈبلیو ہنٹر (مترجم ڈاکٹر صادق حسین) صفحہ ۱۴۵۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ / جون ۲۰۰۲ء

۱۳۔ آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی: غلام حیدر: صفحہ ۴۶: مطبوعہ نیوڈیرآرٹ پرنٹرس، نئی دہلی مارچ ۱۹۸۷ء
۱۴۔ تاریخ ادب اُردو جلد دوم حصہ اول: ڈاکٹر جمیل جالبی: صفحہ ۱۴ اور ۱۵، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول، جون ۱۹۸۲ء
۱۵۔ تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) صفحہ ۲۶۰ مطبوعہ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی طبع اول ۱۹۹۰ء
۱۶۔ علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد ۲، ہندوستانی مسلمان اور تحریکِ آزادی مولانا سید محمد میاں صفحہ ۲۵۶، مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی۔ ۲۶ رجولائی ۱۹۵۷ء
۱۷۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۴۵
۱۸۔ جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون، خورشید مصطفےٰ رضوی، صفحہ ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی طبع اول اپریل ۱۹۵۹ء (ناشر مکتبہ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔ ۶)
۱۹۔ مملکت آصفیہ جلد اول مرتب: ڈاکٹر محمد عبدالحئی، صفحہ ۱۴۳، ناشر ادارہ محبان دکن کوئنس کورٹ عبداللہ ہارون روڈ، کراچی، طبع اول فروری ۱۹۸۷ء
۲۰۔ جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون خورشید مصطفےٰ رضوی: صفحہ ۱۴۰، ۱۴۲، مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی، طبع اول اپریل ۱۹۵۹ء (ناشر مکتبہ برہان اُردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ ۶)
۲۱۔ ایضاً۔ صفحہ ۶۹، ۹۷، ۹۸ اور ۱۰۵
۲۲۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۵۲
۲۳۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۳
۲۴۔ ایضاً ۱۲۴ تا ۱۲۷
۲۵۔ آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی: غلام حیدر، صفحہ ۵۷، مطبوعہ نیوڈیرآرٹ پرنٹرس نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۸۷ء
۲۶۔ جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: خورشید مصطفےٰ رضوی: صفحہ ۱۶۸: مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی طبع اول ۱۹۵۹ء (ناشر مکتبہ برہان اُردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ ۶)

۲۷۔ ایضاً:صفحہ۱۸۴

۲۸۔ ایضاً:صفحہ۱۶۳

۲۹۔ ایضاً۔صفحہ۳۷۹

30- The Discovery of India, Jawahar Lal Nehru : Page 324: Published by Jawahar Lal Nehru Memorial Fundation, Teen Murti House, New Delhi-110011-Twentith Impression 1999

۳۱۔ جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: خورشید مصطفےٰ رضوی: صفحہ۴۳۳: مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی طبع اول ۱۹۵۹ء (ناشر مکتبہ برہان اُردو بازار جامع مسجد، دہلی۔۶)

۳۲۔ ایضاً۔صفحہ۴۰۰

۳۳۔ ایضاً۔صفحہ ۱۹۶

۳۴۔ اس گھر کو آگ لگ گئی: سید عاشورہ کاظمی اور سلیم قریشی: صفحہ۷۷، ۷۸، ۸۰، ۸۱، اور ۸۲، مطبوعہ: انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی: اشاعت اول ۱۹۹۳ء

۳۵۔ جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: خورشید مصطفےٰ رضوی، صفحہ۲۰۲۔ مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی۔ طبع اول ۱۹۵۹ء (ناشر مکتبہ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔۶)

۳۶۔ ایضاً صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵

۳۷۔ اس گھر کو آگ لگ گئی۔ سید عاشور کاظمی اور سلیم قریشی: صفحہ۱۰ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی۔ اشاعت اول ۱۹۹۳ء

۳۸۔ ایضاً صفحہ۴۶

۳۹۔ ایضاً۔صفحہ ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۲، ۹۵، ۱۱۲، ۱۳۹، ۱۴۶، اور ۱۷۵۔

باب سوم

سلطنت آصفیہ کا زوال اور سقوطِ حیدر آباد

مملکت آصفیہ ہندوستان میں محدود علاقائی حیثیت کی حامل تھی پھر بھی دور مغلیہ اور مسلم اقتدار کی آخری یادگار تھی۔ لہٰذا ہندوستان میں مسلم دور حکومت کے خاتمے کی داستان سقوط حیدر آباد اور دولت آصفیہ کے ساتویں بادشاہ نواب میر عثمان علی خان بہادر کی ۱۸ ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو تخت سلطنت سے دست برداری پر مکمل ہوتی ہے۔ اس باب میں دولت آصفیہ کے قیام اور اس کے عروج وزوال اور خاتمہ کے اسباب کا تاریخی حقائق کی روشنی میں جائزہ لیا جائے گا۔

سلطنت آصفیہ کا قیام

دولت آصفیہ کے بانی میر قمر الدین نظام الملک آصف جاہ ترکستان کے ایک معزز خاندان کے سپوت تھے۔ ان کے دادا خواجہ عابد ۱۶۵۶ء میں بخارا سے ہندوستان آئے اور شاہ جہاں کے دربار میں شاہی ملازمت حاصل کی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں انھیں چار ہزار منصب پر مامور کیا گیا۔

۱۶۶۸ء میں اجمیر اور ۱۶۷۲ء میں ملتان کے صوبہ دار مقرر کیے گئے۔ ۱۶۸۲ء میں بیدر کے صوبہ دار بنائے گئے۔ ۱۶۸۷ء میں گولکنڈے کے باہر انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

خواجہ عابد کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں میر شہاب الدین فیروز جنگ سب سے بڑے تھے اور سب سے نامور بھی۔ اورنگ زیب نے انھیں خلیج خان کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کی شادی شاہ جہاں کے وزیر سعد اللہ خان کی بیٹی سے ہوئی تھی جس کے بطن سے ۱۱ ر اگست ۱۶۷۱ء کو میر قمر الدین پیدا ہوئے جو بعد میں چل کر نظام الملک آصف جاہ کے نام سے شہرت حاصل کی۔

۲۰ سال کی عمر میں (۱۶۹۰ء) اورنگ زیب نے انھیں چین قلیچ خان بہادر کا خطاب دیا۔اس وقت سے نظام الملک کی فوجی خدمات کا آغاز ہوتا ہے۔ابتداء میں انھیں مرہٹوں کے خلاف فوجی مہمات میں بھیجا گیا۔۱۷۰۲ء میں صوبہ بیجاپور اور ۱۷۰۳ء میں صوبہ حیدرآباد کی فوجداری پر مامور ہوئے۔۱۷۰۵ء میں قلعہ واکنکھیڑہ کے محاصرہ کے دوران ان کی عسکری صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہوا۔اسی سال انھیں بیجاپور کی صوبہ داری پر دوبارہ مامور کیا گیا۔اور پانچ ہزاری منصب پر فائز کیا گیا۔[1]

اورنگ زیب کے آخری دنوں میں اور اس کے انتقال کے بعد سلطنت مغلیہ کے سب سے طاقتور سیاسی گروہ یعنی تورانی امراء میں اسدخان وزیراعظم اور ذوالفقار خان سپہ سالار کے بعد نظام الملک سب سے بااثر سیاسی شخصیت تھے۔اسد خان اور ذوالفقار خان کے انتقال کے بعد تورانی امراء کی قیادت نظام الملک کے حصے میں آئی۔محمد شاہ نے جب سادات بارہبہ سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو خود محمد شاہ اور اس کی ماں نے نظام الملک سے درخواست کی کہ وہ سیدوں کا خاتمہ کرنے میں شہنشاہ کی مدد کریں۔اس کے بدلے میں انھیں وزیراعظم کا عہدہ دینے کا وعدہ کیا گیا۔نظام الملک اس وقت دکن کے صوبہ دار تھے۔ایک طویل خانہ جنگی اور کشمکش کے بعد سید برادران کا خاتمہ ہوگیا۔محمد شاہ نے نظام الملک سے کیے گئے وعدہ کو فراموش کر کے محمد امین خان کو وزیراعظم مقرر کر دیا۔محمد امین خان زیادہ دنوں تک وزارت کے عہدے سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔۱۷۲۱ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔اس کے انتقال کے بعد تورانی امراء میں وزارت کے لئے رسہ کشی شروع ہوگئی تو مجبور ہو کر محمد شاہ نے نظام الملک کے نام وزارت کا فرمان جاری کیا۔اس فرمان کے ملتے ہی نظام الملک دکن کی صوبہ داری پر اپنے پھوپھا کو نائب صوبہ دار مقرر کر کے دہلی پہنچ گئے۔اور ۱۷۲۲ء میں وزارت کا عہدہ سنبھال لیا۔وہ زمانہ سلطنت مغلیہ کا بدترین دور تھا حکومت کے معاملات انتہائی ابتر حالات میں تھے۔ارکان سلطنت اور خود محمد شاہ عیش وعشرت اور آپس کی رسہ کشی کے ماحول میں اس قدر ملوث تھے کہ انتظام سلطنت مکمل انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔نظام الملک اپنی اعلیٰ فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے باوجود اراکین

سلطنت کو راہ راست پر نہ لا سکے اور نہ نظم ونسق کو درست کر سکے۔ چنانچہ مایوس ہوکر انھوں نے دکن کا رخ کیا۔ اس وقت دکن میں مرہٹوں کا غلبہ بڑھتا جارہا تھا۔ اور عین ممکن تھا کہ دکن پوری طرح سے مرہٹوں کے قبضہ میں چلا جاتا۔ بہادر شاہ کے زمانے میں جنوب کے چھے صوبوں خاندیس، اورنگ آباد، برار، محمد آباد بیدر، بیجاپور اور حیدر آباد کو ملا کر ایک صوبہ پر نظام الملک کا کئی بار تقرر کیا گیا تھا۔ ان کے دادا جو سمرقند اور بخارا کی خاک سے اٹھے تھے۔ دکن کی خاک میں مدفون تھے۔ ان کے والد میر شہاب الدین فیروز جنگ جو خلیج خان کے خطاب سے سرفراز تھے دکن کی لڑائیوں میں اپنی انکھوں کی قربانی دے چکے تھے۔ اس طرح دکن نظام الملک کے لئے وطن مولود سے بڑھ کر تھا۔ نظام الملک نے جان لیا تھا کہ مغل سلطنت کے زوال کو روکنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر وہ دہلی میں بیٹھ کر مغل سلطنت کو بچانے کی کوشش میں لگے رہتے تو عین ممکن تھا کہ دکن مغلیہ سلطنت سے کٹ جاتا۔ چنانچہ انھوں نے دکن کو بچانے کا فیصلہ کر لیا اور دکن ہی پہنچ کر ۱۱ر اکتوبر ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ [۲]

نظام الملک صحیح معنوں میں مغلیہ سلطنت اور اس کی روایات کے وارث تھے۔ اپنی فطری اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے انھوں نے اورنگ زیب کے زیر تربیت کاروبار جہاں بانی کے سارے گر سیکھ لیے تھے۔ ان کے دادا ان کے والد اور خود نظام الملک نے تین پشتوں تک سلطنت کی بے لوث خدمت کی تھی۔ اورنگ زیب کی نگاہ میں نظام الملک کی بہت قدر ومنزلت تھی۔ اپنے آخری زمانے میں اورنگ زیب نے اپنے چھوٹے بیٹے کام بخش کی بیٹی سے نظام الملک کے بیاہ کی تجویز رکھی تھی۔ نظام الملک شاہی خاندان سے ازدواجی رشتے کے خطرناک جال میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ بوجہ انھوں نے اس رشتے کو قبول نہیں کیا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں۔ "یہ ایسی تدبیر تھی کہ اگر بادشاہ اس میں کامیاب ہوجاتا تو بہت ممکن تھا کہ اس کی وفات کے بعد خانہ جنگی میں معظم کے بجائے کام بخش کو کامیابی حاصل ہوتی یا کم از کم دکن میں اس کی جداگانہ سلطنت قائم ہوجاتی۔ لیکن چین خلیج خان جو سیاست میں عالمگیر ہی کے شاگرد تھے۔ اس نکتہ کو سمجھ گئے

اور انھوں نے اس عزت کو قبول کرنے سے معذرت چاہی جس کے لئے انھیں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اتنے بڑے مہلکوں میں ڈالنا پڑتا۔"[43] اگر نظام الملک اس رشتے سے منسلک ہو جاتے تو یہ بھی عین ممکن تھا کہ نادر شاہ مغل سلطنت کو دیوالیہ کرنے کے بعد شاہی خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے نظام الملک کو تخت شاہی سونپ کر چلا جاتا۔

مملکت آصفیہ کی سیاسی حیثیت:

شاہی خاندان اور رعایا کے تعلقات کے بارے میں مولانا مودودی نے ایک کلیہ بیان فرمایا ہے۔اس کلیہ کی بنیاد مشرقی اخلاقی قدر پر مبنی ہے۔ لکھتے ہیں۔"مشرق میں جب کوئی سلطنت طویل مدت تک قائم رہ جاتی ہے۔اور باشندے اس کے شاہی خاندان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔تو پھر اس کی انتہائی کمزوری، نالائقی اور بدنظمی کے باوجود ایک زمانہ دراز تک کوئی شخص اس کے خلاف علانیہ بغاوت کی جرات نہیں کرسکتا۔اس کے صوبہ دار عملاً خود مختار فرمانروا بن جاتے ہیں۔مگر ظاہر میں وفاداری و اطاعت کا دم بھرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اور جو کوئی اس کے مقابلہ میں شاہی کا دعویٰ کرتا ہے اسے رائے عامہ کی ایسی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس کی نئی بادشاہی کی جڑ بنیاد ہل جاتی ہے۔سلطنت مغلیہ کو جس چیز نے انتہائی ضعف اور انتشار کے باوجود سوڈیڑھ سو برس تک ہندوستان کی سیاست پر برقرار رکھا وہ یہی خیالی قوت تھی۔اس نے ذوالفقار خان کو قوت و اقتدار کے منتہے پر پہنچ جانے کے باوجود بادشاہی کا دعویٰ کرنے سے باز رکھا۔اس نے سادات بارہیہ کو بادشاہ گر بن جانے کے باوجود بادشاہ بن جانے سے روکا۔اور اسی نے نظام الملک کو دکن کی بادشاہی کا اعلان کرنے سے محترز رکھا۔"[44] چنانچہ نظام الملک نے ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد ضرور ڈالی لیکن بادشاہی یعنی اقتدار اعلیٰ کا اعلان نہیں کیا۔اگرچہ کہ سیاسی اور انتظامی معاملات میں نظام الملک ایک خود مختار حاکم تھے۔مگر انھوں نے اور ان کے جانشینوں نے بادشاہت کا اعلان نہیں کیا۔سیاسی اعتبار سے وہ بہ ظاہر مغل سلطنت کے صوبہ دار تھے۔اور یہ حیثیت ۱۸۵۷ء تک باقی رہی۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب مغل اقتدار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تو

آصفیہ سلطنت کے حاکم وقت نواب افضل الدولہ آصف جاہ پنجم نے ۱۸۵۸ء میں بادشاہت کے اعلان کے ساتھ اپنے نام کا خطبہ جاری کیا۔ یہاں سے اقطاع ہند کے عوام نے مملکت آصفیہ کو مغل سلطنت کے باقیات اور اس کے وارث کے طور پر تسلیم کرلیا۔

سلطنت آصفیہ کا عروج وزوال

سلطنت آصفیہ کے عروج وزوال کی داستان کو علیحدہ علیحدہ ابواب کے تحت مرتب کرنا انتہائی دشوار ہے۔ جن مورخوں نے مملکت آصفیہ پر قلم اٹھایا ہے انھوں نے ریاست کے اندرونی معاملات، اس کے معاشی اور معاشرتی حالات اور ریاستی عوام کی فلاح و بہبود کے حوالے سے آصفیہ حکمرانوں کے طرز حکومت پر خامہ فرسائی کی ہے۔ خصوصاً مذہبی رواداری گنگا جمنی تہذیب کے فروغ اور بین الطبقاتی یکجہتی کے لئے شاہانِ آصفیہ نے جو ماحول ریاست کے اندر پیدا کیا تھا اس کے بارے میں تاریخ کے صفحات پر بہت کچھ مل جائے گا۔ لیکن تاریخ کے صفحات الٹ کر جب ہم اس کے سیاسی عروج کی داستان تلاش کرتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ نظام الملک آصف جاہ اول کے وارثوں نے جو مملکت بانیِ سلطنت سے حاصل کی تھی اس کی سالمیت کو وہ برقرار نہیں رکھ سکے۔ ایک حد تک ہم نظام الملک آصف جاہ اول کو مملکت آصفیہ کا اورنگ زیب کہہ سکتے ہیں۔ اورنگ زیب کے بعد جس طرح اس کے جانشینوں کی نااہلی سے مغلیہ سلطنت سکڑ کر 'از دلی تا پالم' رہ گئی تھی۔ اُسی طرح نظام الملک کے جانشینوں کے زمانے میں سلطنت آصفیہ سکڑ کر حیدرآباد کے گرد ونواح کے ایک محدود علاقے تک رہ گئی تھی۔ آصفیہ حکمرانوں نے کبھی میدان جنگ کی صورت نہیں دیکھی اور نہ کسی فوجی مہم میں سالاری کے فرائض انجام دئے۔ ان کے سر پر سجے تاج شاہی میں کسی فتح مبیں کا سرخاب کا کوئی پر نہیں لگا۔ ہندوستان جنت نشان میں در آنے والے سیاسی انقلاب اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی شاطرانہ چالوں اور خالص غاصبانہ تجارتی ذہنیت کے جواب میں شاہان آصفیہ نے سیاسی سوجھ بوجھ اور عسکری تدبّر کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ اور نہ دوست دشمن میں تمیز کی۔ جن کو دوست بنا سکتے تھے ان سے دشمنی کا رویہ اختیار

Ahmedabad
R. Narbada
Hoshangabad
Handia
Sultanpur
Asirgarh
Surat
Nadurbar
Burhanpur
Ellichpur
Amravati
Nagpur
Akola
Balapur
Baitalbardi
Deogirh
Gulshanabad
Daulatabad
Aurangabad
Basam
Mahur
Chanda
Jalna
Sangamnir
Pattan
Patharie
Sirpur
Ahmednagar
Nanded
Jagtial
Bir
Ramlaire
Poona
Dharur
Elgandal
Parkal
Malangur
Parenda
Kolas
Satara
Kalyan
Medak
Warangal
Tuljapur
Sholapur
Ankalkot
Bider
Bhongir
Naldurg
Golkonda
Hyderabad
Khammammet
Rajahmundary
Gulbarga
Malkhed
Panhalla
Bijapur
Nalgonda
MARATHAS
Sagar
Ghanapur
Ellore
Kolapur
Talikota
Shorapur
Deverkonda
Machlipattan
Murtuzanagar (Guntur)
Pangal
Mudgal
Raichur
Udgir
Kurnol
Adhoni
Kuppal
Kumbum
Bijanagar (Vijayanagar)
Gooty
Sadhot
Gandikota
Nellore
Chitaldurg
Goramkonda
Sira
Chandragiri
Vellore
Madras
Chinnapattan
Kanji
Srirangapattan
Bangalore
Chingalpet
Mysore
Jinji
Pondichery
Palamkot
Trichinopally
Thanjavu
Cochin
Rameshwaram
CEYLON
R. Godavari

(1) صوبہ اورنگ آباد
(2) صوبہ خاندیس
(3) صوبہ برار
(4) صوبہ محمد آباد بیدر
(5) صوبہ بیجاپور
(6) صوبہ حیدر آباد

حدود

کیا اور جو واقعی دشمن تھے ان سے دوستی کی تمنا کی۔ تاریخ کا یہ المیہ مورخ کے لئے زہر کا پیالہ ہے جو بہر صورت اُسے پینا پڑتا ہے۔ لہٰذا سلطنت آصفیہ کی جو داستان لکھی جا سکتی ہے وہ انحطاط اور انقیاد کی داستان ہوگی۔

۱۷۴۸ء میں نظام الملک آصف جاہ اول کے انتقال کے وقت آصف جاہی مملکت کی عملداری میں دکن کے چھ صوبے خاندیس، اورنگ آباد، برار، محمد آباد بیدر، بیجاپور اور حیدر آباد شامل تھے ان کی آمدنی ۲۰ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ یہ مالیہ مغل سلطنت کے کل خزانے کا ایک تہائی حصہ تھا۔ اس کے حدود مشرق میں اُڑیسہ، مغرب میں ناسِک، شمال میں دریائے نربدا اور جنوب میں رامیشورم تک پھیلے ہوئے تھے۔۵ یہ نئی سلطنت ہر لحاظ سے ایک مضبوط سلطنت تھی۔ مغل سلطنت کے صوبہ دار کی حیثیت سے اس کے فرمانروا کو تمام جنوبی ہند کے امراء اور فوجی سربراہوں کی اطاعت اور وفاداری حاصل تھی۔ یہ ایک تربیت یافتہ تجربہ کار فوج کے مالک تھے۔ جس کی مدد سے وہ مرہٹوں کی طاقت کو جسے عالمگیر نے بڑی حد تک کمزور کر دیا تھا، دبا کر تابع فرمان کر سکتے تھے۔ آصف جاہ نے سلطنت کی حفاظت کے پیش نظر خاص طور پر جنوب مغرب کے نالکوں، پالیگروں اور چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو قابوں میں رکھنے کی خاطر اپنے نواسے نواب مظفر جنگ کو بیجاپور کا ناظم اور صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ اس طرح اس سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھ کر سارے جنوبی ہند کو ایک مرکزی نظم و نسق کے تحت منظم کرنے کے امکانات روشن تھے۔ اگر آصف جاہ کے جانشین اس امکانی تاریخ کے معمار ہوتے تو شاید انگریزوں اور فرانسیسیوں کو وہ مواقع حاصل نہ ہو سکتے تھے جو ان کو آصف جاہ اول کے انتقال کے فوری بعد حاصل ہوئے۔ اور جن کی بدولت ہندوستان کی تاریخ کا رخ ہی بدل گیا جس کو ہم ذلت آمیز غلامی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد ان کے دوسرے صاحب زادے ناصر جنگ تخت نشین ہوئے۔ بیجاپور کے صوبہ دار نواب مظفر جنگ کے دل و دماغ میں تخت و تاج کے ہوس نے سر اُٹھایا اور وہ اپنے ماموں سے لڑ پڑے۔ ۲ سال کے اندر اندر فوجی کارروائی کے دوران دونوں حضرات کام آئے۔ ان کے بعد صلابت جنگ تخت نشین ہوئے۔ ان کے دور حکومت

میں ۱۲ سال تک دکن میں خانہ جنگی کا ماحول رہا۔ یعنی دہلی میں جو ڈرامہ کھیلا گیا تھا وہ اب دکن میں کھیلا جا رہا تھا۔ دہلی کے ڈرامے میں سارے کردار مقامی تھے لیکن دکن کے ڈرامے میں انگریز اور فرانسیسی شامل تھے۔ صلابت جنگ کے دربار میں فرانسیسی چھائے ہوئے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے فرانسیسی مقبوضات پر حملہ کیا۔ صلابت جنگ فرانسیسیوں کی حمایت میں اس جنگ میں شامل ہو گئے۔ انگریزوں نے نہایت چالاکی سے صلح کی درخواست کی۔ ۱۷۵۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور سلطنت آصفیہ کے بیچ پہلا صلح نامہ طے پایا جسے پہلا تہہ نامہ کہا جاتا ہے۔ اس تہہ نامہ کے نتیجے میں صلابت جنگ نے خلیج بنگال کے سمندری راستے والا علاقہ مچھلی پٹنم اور نظام پٹنم بطور انعام انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ بدلے میں انگریزوں سے فوجی امداد کا وعدہ لیا گیا۔[٦] تاریخ کے صفحات الٹیے اور اس راز سربستہ کی عقدہ کشائی کیجئے کہ وہ کون سی سیاسی یا عسکری قوت تھی جس کے خلاف فوجی امداد کا وعدہ لیکر صلابت جنگ نے اپنی مملکت کی لائف لائین یعنی سمندری راستہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ جنوب میں اس وقت صرف ایک طاقت اُبھر رہی تھی اور وہ حیدر علی کی تھی۔ انگریزوں کے مقابل حیدر علی سے دوستی پائیدار اور زیادہ قابل بھروسہ ہو سکتی تھی۔ ان نکات اور مرہٹے! شیواجی کی گدی کو حاصل کرنے کی خاطر مرہٹہ سردار باہمی جنگ و جدل میں الجھے ہوئے تھے۔ اگر نظام اور حیدر علی دفاعی معاہدہ کر لیتے تو ملکی مفاد کے پیش نظر مرہٹوں کو دوستی پر مائل کرنا شاید مشکل نہ ہوتا۔ ان نکات کو سمجھنے کے لئے سیاسی تدبر اور بصیرت درکار تھی۔ شاید قدرت نے آصف جاہ کے جانشینوں کو اس نعمت سے محروم رکھا تھا۔

۱۷۶۱ء میں درباریوں اور وزراء نے صلابت جنگ کو معزول کر کے نظر بند کر دیا اور نظام الملک کے چوتھے فرزند نظام علی خان کو تخت نشین کیا۔ نظام علی خان کی تخت نشینی سے سلطنت آصفیہ کے زوال کی داستان شروع ہوتی ہے۔ صلابت جنگ یعنی بڑے بھائی شمال مشرق کے سمندری علاقے انگریزوں کو دے چکے تھے۔ نظام علی خان یعنی چھوٹے بھائی نے ۱۷۶۶ء میں جنوب مشرق کے سمندری علاقے راجمندری ایلور اور گنٹور انگریزوں کے حوالے کر دے۔ ۱۸۰۰ء میں ایک اور معاہدہ طے پایا جس کے تحت انگریزوں کو نظام کی

حفاظت کے لئے ایک صیانتی فوج تیار رکھنی تھی اور بدلے میں کرناٹک جسے قدیم کرناٹک بالا گھاٹ کہا جاتا ہے فوجی اخراجات کے لئے انگریزوں کے حوالے کردیا گیا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں مشرق کے سارے ساحلی علاقے اور جنوب کا بہت بڑا علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ مغربی علاقوں پر مرہٹوں نے قبضہ کرلیا اور جنوب مغربی علاقے میسور کی ریاست میں ضم ہوگئے۔ شمال مشرقی اور جنوب مشرقی علاقے نظام نے اپنی مرضی سے انگریزوں کے حوالے کئے تھے۔ مرہٹوں نے جن علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا اس کے بارے میں نظام نے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن جو علاقے میسور کی ریاست میں ضم ہوگئے تھے ان کی بازیافت کی انھیں فکر لگی رہتی تھی۔ کیونکہ انگریز جنوبی ہند میں کسی انگریز دشمن مسلم طاقت کو باقی رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ میسور کی چوتھی جنگ میں نظام علی خان نے میسور میں ضم شدہ علاقوں کو حاصل کرنے کی غرض سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد حسب وعدہ میسور کا علاقہ نظام کو دیا جانا تھا لیکن انگریز نظام کو بھی طاقتور دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا نظام سے کئے وعدہ کو یکسر نظر انداز کرکے انگریزوں نے سوائے کڑپہ اور بلاری کے میسور کا سارا علاقہ راجگان میسور کے قدیم خاندان کے حوالے کردیا۔
کڑپہ اور بلاری کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ سالانہ تھی یہ بھی انگریزوں کو کھٹکنے لگی۔ چنانچہ نظام کو اس آمدنی سے محروم کرنے کے لئے ۱۸۰۰ء میں وہ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے دونوں حکومتوں پر کسی تیسری طاقت کا حملہ ہو تو دونوں مل کر مقابلہ کریں گے اور انگریز نظام کی سلطنت کی حفاظت کریں گے۔ اس حفاظت کی خاطر ایک نئی فوج رکھی جائے گی اور اس کے اخراجات کی پابجائی کے لئے کڑپہ اور بلاری انگریزوں کو واپس کردے جائیں گے۔ اس معاہدہ کو عہد معاونت Subsidiary Alliance کہا جاتا ہے۔[1] اس معاہدے نے مملکت آصفیہ کی آزادی کو سلب کرکے رکھ دیا۔ اب وہ اندرون ملک کسی ریاست یا بیرون ہند کسی ملک سے سیاسی، سفارتی اور تجارتی تعلقات استوار نہیں کرسکتی تھی۔ اس معاہدہ سے قبل سلطنت آصفیہ سمندری راستے سے محروم ہوچکی تھی۔ چنانچہ سمندری راستے سے محرومی اور اس معاہدہ غلامی کی بنیاد پر یہ ریاست باہر کی دنیا سے ہمیشہ کے لئے کٹ گئی۔ اس معاہدے کی بنیاد پر جو فوج ترتیب دی گئی تھی وہ انگریزوں کے قبضہ اختیار میں تھی۔ یعنی یہ ریاست

اپنی دفاع کے لئے بھی انگریزوں کی محتاج ہو کر رہ گئی۔

۱۸۰۰ء میں نظام علی خان کو کس فوجی طاقت سے خطرہ تھا؟ ٹیپو سلطان کو انگریزوں کے خلاف مجاہدانہ سرگرمیوں سے جو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی اس سے نظام علی خان سخت پریشان تھے۔ اُسے ختم کرنے کی خاطر انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ سلطنت آصفیہ کے قیام اور حیدر علی کے عروج سے دکن کے سیاسی جغرافیہ میں جو تبدیلی آرہی تھی اس سے نظام اگر فائدہ اُٹھاتے تو سلطنت آصفیہ اور سلطنت خداداد کے اتحاد سے ایک ایسی عسکری قوت وجود میں آتی جو دکن میں انگریزی سامراجیت کے خلاف سد سکندری ثابت ہوتی۔ اور عین ممکن تھا کہ مرہٹے جو اس وقت شمال میں مغلیہ علاقوں کو تاخت وتاراج کرنے میں مصروف تھے، دکن میں اپنے باقیات کو مستحکم کرنے کی غرض سے اس اتحاد میں شامل ہو جاتے۔ کیونکہ میسور کی چوتھی جنگ میں انگریزوں کی دعوت پر مرہٹوں نے انکا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پیشوا نے جنگ میں شرکت سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ٹیپو کے خلاف ہتھیار اٹھانا نادانی ہے اور ملک سے غداری کے برابر ہے۔ لیکن نظام کو ہر وقت ایک خیالی دشمن ڈراتا رہا۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد دشمن ختم ہو گیا۔ مرہٹے شمال میں مصروف پیکار تھے اور انگریز انھیں ختم کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب نظام کو کس تیسری طاقت کا خطرہ تھا کہ وہ عہد معاونت کے خوش آئند نام کے دھوکے میں اپنی آزادی کا سودا کر لیا۔ اور سلطنت آصفیہ کے ایک خود مختار حاکم کے بجائے ایک محدود ریاست حیدرآباد کے نام نہاد حکمران بن بیٹھے۔ تاریخ کے صفحات پر میر جعفر اور میر صادق کے نام تو ثبت ہیں لیکن کسی نے میر عالم کا نام اس فہرست میں شامل کرنے کی نہیں سوچی۔ یہ نظام علی خان کے نہایت شاطر وزیر اعلیٰ تھے۔ تنخواہ شاہی خزانے سے لیتے لیکن تھے انگریزوں کے غلام۔ چنانچہ اس غلامِ ازلی نے اپنے مالک کو بھی انگریزوں کا غلام بنا کر اپنی صف میں کھڑا کر لیا۔

اس معاہدے کے بعد نظام علی خان زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔ ۱۸۰۳ء میں ان کے انتقال کے بعد نواب سکندر جاہ تخت نشین ہوئے۔ سلاطین آصفیہ میں سکندر جاہ کا ایک خاص امتیاز ہے یہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ سکندر جاہ کے اس وصف کو انگریز دشمنی سے زیادہ

وطن دوستی اور آزادی کی تڑپ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سلطنت آصفیہ کو انگریزوں کی غلامی سے نکالنے کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے۔لیکن ۱۸۰۰ء کے معاہدہ غلامی نے انھیں بے بس کردیا۔ راجہ مہی پت رام نے جو نواب سکندر جاہ کے فوجی مشیر تھے اس معاہدے کے خلاف پہلی آواز اٹھائی۔ انھوں نے ریاست حیدر آباد کے اندر اور باہر وطن دوست طاقتوں کو منظم کیا اور انگریز بالا دستی کو ختم کرنے کی منظم کوشش شروع کردی۔ میر عالم نے انگریز ریزنڈنٹ سے مل کر راجہ مہی پت رام کو نظام کے دربار سے نکلوادیا لیکن اس محبّ وطن نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بہت پہلے انگریز اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ساری زندگی وقف کردی۔ اسی دھن میں اپنی جان قربان کردی۔ مہی پت رام کے بعد شہزادہ مبازالدولہ نے جو نواب سکندر جاہ کے فرزند تھے انگریز بالا دستی کے خلاف تحریک شروع کی۔ مبارزالدولہ کی تحریک صرف اندروں ریاست تک محدود نہیں تھی۔ انھوں نے سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین سے ربط پیدا کیا۔ اور نامہ بروں کے ذریعہ مہاراجہ جودھپور، راجہ ستارہ، مہاراجہ پٹیالہ، نواب بھوپال اور نواب کرنول سے ربط پیدا کیا اور انھیں اس جدوجہد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس تحریک کی عمل آوری سے قبل انگریز ریزیڈنٹ کو مبارزلدولہ کی سرگرمیوں کا پتہ چل گیا۔ انگریزوں نے شہزادے کے محل پر فوجی حملہ کردیا۔ اور دوروزہ جنگ کے بعد شہزادے کو گرفتار کرکے قید کردیا۔ اور ساری زندگی قید رکھا۔ بادشاہ وقت سکندر جاہ بھی اپنے بیٹے کو قید فرنگ سے نہیں چھڑا سکے۔[۸] سروجنی ریگانی نے اپنے Ph.D. کے مقالے میں مبارزالدولہ کے بارے میں بہت تفصیلات دی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ مبارزالدولہ حیدر آباد میں تحریک مجاہدین کے ممتاز رہنما تھے۔ حیدر آباد میں ان کی جدوجہد ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔*

۱۸۲۹ء میں سکندرجاہ کا انتقال ہوگیا۔ سکندر جاہ کے بعد ناصر الدولہ تخت نشین

*: سروجنی ریگانی عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے شعبۂ تاریخ کی صدر رہ چکی ہیں۔ انہوں نے اس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان کا مقالہ Nizam British Relations کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ مقالہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ یہ معلومات ہمیں ڈاکٹر سید داود اشرف صاحب نے فراہم کی ہیں۔ (فاروقی)

ہوئے۔ ان کے دور میں انگریزوں نے برار کا علاقہ ہڑپ کرلیا۔ ۱۸۵۷ء میں ناصر الدولہ کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ افضل الدولہ تخت نشین ہوئے۔ افضل الدولہ نے ۱۲ سال حکومت کی۔ ۱۸۶۹ء میں انتقال کے وقت میر محبوب علی خان وارث تخت و تاج صرف ۳ سال کے تھے۔ سالار جنگ اول نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور وکیل مطلق کے طور پر انتظام سلطنت چلاتے رہے۔ میر محبوب علی خان ۱۸۸۴ء میں مسند نشیں ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں انتقال کیا۔ ان کے بعد سلطنت آصفیہ کے ساتویں حکمران نواب میر عثمان علی خان تخت نشین ہوئے اور سقوط حیدر آباد ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء تک حکومت کرتے رہے۔ [9]

عہد معاونت کے تحت جو فوج ترتیب دی گئی تھی اُسے انگریزوں نے اہم ضرورت کے وقت بھی نظام کے حوالے نہیں کیا۔ اس بارے میں جب نظام نے انگریزوں کو بار بار یاد دہانی کروائی تو انگریز گورنر جنرل نے ناصر الدولہ کے زمانے میں ایک اور تجویز رکھی کہ ضمانتی فوج کے علاوہ مزید فوج رکھی جائے۔ اس وقت سراج الملک، سالار جنگ اول کے چچا مدار المہام تھے۔ ناصر الدولہ اور سراج الملک دونوں اس بات پر راضی نہ ہوئے تو ان کے دیوان چندو لعل کو شیشے میں اُتارا گیا۔ چندو لعل نے ناصر الدولہ کی مرضی کے خلاف گورنر جنرل کی تجویز سے اتفاق کرلیا۔ اور ۲ ہزار سواروں کی فوج تیار کی گئی۔ جس کے سالانہ اخراجات ۴۰ لاکھ روپیہ نظام کے خزانے پر عاید ہونے لگے۔ اس وقت ریاست حیدر آباد کی مالی حالت نہایت خستہ تھی۔ شاہی خزانے سے فوج کے اخراجات کی پابجائی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ فوج کی تنخواہیں ریزیڈنٹ کے خزانے سے ادا ہونے لگیں۔ ۱۸۵۰ء تک نظام کے اوپر قرض کا بوجھ ۷۰ لاکھ روپیہ سے تجاوز کر گیا۔ اس قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں انگریزوں نے نظام پر دباؤ ڈال کر اور فوجی کاروائی کی دھمکی دے کر برار کا علاقہ ۱۸۵۳ء میں حاصل کرلیا۔ [10]

تاریخ عالم میں ایسی مثال شاید ہی ملے کہ ایک تاجروں کا گروہ حالات کی ستم ظریفی سے ایک سیاسی اور فوجی گروہ میں تبدیلی ہو کر ایک اجنبی ملک میں وہاں کے مقامی حکمران کو مجبور کر کے اس کی حفاظت کے لئے ایک فوج ترتیب دیتا ہے۔ فوجی اخراجات اپنے خزانے سے ادا کرتا ہے اور خرچ کی رقم کو مقامی حکمران پر بطور قرض لاد دیتا ہے اور پھر قرض کی عدم

ادائیگی کی بناء پراس کی مملکت کا ایک زرخیز علاقہ ہڑپ کرلیتا ہے۔ دوسرا عجوبہ یہ ہے کہ مقامی حکمران اس فوج سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا کیونکہ فوج اس کے کنٹرول میں نہیں ہے بلکہ اسی تاجر گروہ کے کنٹرول میں رہتی ہے۔

مدارالمہام سراج الملک کے بعد ان کے بھتیجے سالار جنگ مدارالمہام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ انھیں اس بات کا خلق تھا کہ ان کے چچا کے دور میں نظام نے ایک زرخیز علاقہ کھودیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سالار جنگ اول نے انگریزوں سے برار کا علاقہ واپس لینے کے لئے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ برار کی واپسی کے مسئلے کو سالار جنگ اول نے اپنے وقار کا مسلہ بنالیا تھا۔ وہ برار واپس لے کر اپنے خاندان پر لگے داغ کو دھونا چاہتے تھے۔۱۱ لیکن یہ کام انھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی بھر پور مدد کرنے کے بعد شروع کیا۔ شاید وہ انگریزوں کو ایک مصنف مزاج اور وعدہ ایفا کرنے والی قابل بھروسہ قوم تصور کرتے تھے۔ اس نافہمی کی وجہ سے انھوں نے اور نظام نے دوسری بڑی غلطی کی۔ اگر نظام انگریزوں سے اپنی شرائط منوانے کے بعد مدد کرتے تو شاید برار کے بجائے مشرق کے سمندری علاقوں کا کچھ حصہ حاصل کرسکتے تھے۔ نظام نے دکن کی ۳ مقامی طاقتوں کو متحدہ کرکے انگریزوں کے خلاف کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی وہ نظام دوم کی پہلی غلطی تھی۔ اور ۱۸۵۷ء میں یہ دوسری بڑی غلطی تھی۔ جب کہ انگریز اپنی موت وزیست سے دوچار تھے اس وقت اپنے علاقوں کی بازیافت کا مطالبہ کئے بغیر ان کی مدد کی گئی۔ گورنر بمبی نے حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کو تار دیا تھا کہ اگر نظام ساتھ نہ دیں تو سب کچھ ختم ہوجائے گا۔۱۲ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عوامی تحریک کا ساتھ دیکر انگریزی تسلط سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا تھا۔ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر آعظم سالار جنگ نے کمپنی بہادر کے راج کو باقی رکھنے کے لئے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ برطانوی تسلط سے چھٹکارا پانے کے لئے جو جدوجہد راجہ مہی پت رام اور مبارز الدولہ نے کی تھی اس کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی تھی۔ حیدرآبادی عوام انگریزی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بے چین تھے۔ اوران کو مولوی علاء الدین کی شکل میں ایک قابل رہنما مل گیا۔ مولوی علاء الدین حیدرآباد کے سربراوردہ علماء میں

تھے۔ان کا نظریہ تھا کہ غازی کی طرح سے مرنا چاہیے۔چنانچہ ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو مولوی علاء الدین کی رہنمائی میں عوام کی ایک بڑی تعداد نے انگریز ریزیڈنٹ کی رہائش گاہ پر حملہ کر دیا۔اس حملے میں طرہ باز خان بھی اپنی جمعیت کے ساتھ شریک ہو گئے۔طرہ باز خان حیدر آباد کے ایک صاحب ثروت اور بااثر پٹھان جمعدار تھے۔ان کے پاس پٹھانوں کی ایک تربیت یافتہ جمعیت تھی۔مجاہدین کے پاس معمولی ہتھیار تھے وہ ریزیڈنسی کی باضابطہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور پسپا ہو گئے۔لڑائی کے دوران طرہ باز خان زخمی ہو گئے اور اسی حالت میں فرار ہو کر روپوش ہو گئے۔بعد ازاں کئی ایک فوجی کاروائی کے دوران وہ دشمن کی گولی کا نشانہ بن گئے۔مولوی علاء الدین جنھوں نے ریزیڈنسی پر حملے کی رہنمائی کی تھی، مجاہدین کی پسپائی کے بعد وہاں سے فرار ہو گئے۔انھیں منگلا پلی نامی مقام پر گرفتار کیا گیا اور حبس دوام کی سزا دے کر کالا پانی (جزائر انڈمان نکوبار) بھیج دیا گیا۔مولوی علاء الدین صاحب نے تقریباً ۳۰ سال کا عرصہ قید میں رہ کر وہیں انتقال کیا۔

سلطنت آصفیہ اور برٹش انڈیا کے تعلقات

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں تاج برطانیہ کے مکمل تعاون سے ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے سامراجی عزائم میں کامیاب ہو گئی۔۱۸۶۰ء میں تاج برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بے دخل کر کے اپنا اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری کے سارے علاقے پر مسلط کر دیا۔اس تاریخ سے ہندوستان سیاسی اعتبار سے دو حصوں میں بٹ گیا تاج برطانیہ کے زیر اقتدار ہندوستان برٹش انڈیا کہلایا اور دوسرا حصہ جو مقامی راجاؤں اور نوابوں کی عملداری میں تھا اس کو دیسی ریاستوں کا نام دیا گیا۔برٹش انڈیا پر کمپنی نے راست فوجی کاروائیوں کے ذریعہ قبضہ کیا تھا۔اور دیسی ریاستوں کو مختلف نوعیت کے جائز اور ناجائز معاہدات کے ذریعہ اپنا تابع فرمان کر لیا تھا۔دیسی ریاستوں سے کمپنی کے جو معاہدات تھے وہ دوستانہ اور حلیفانہ بنیاد پر دو آزاد اور خود مختار حکمرانوں کے درمیان طے پائے تھے۔دونوں میں سے کسی ایک فریق کو یہ حق اور اختیار نہیں تھا کہ ان معاہدات کو وہ ایک تیسری طاقت کو منتقل یا فروخت کرے۔تاج

برطانیہ نے برٹش انڈیا پر اپنا اقتدار مسلط کرنے کے بعد دیسی ریاستوں کی طرف توجہ کی۔ دیسی ریاستوں پر تسلط حاصل کرنے کی غرض سے پیرا مونٹسی (Paramountcy) کا نظریہ ایجاد کیا گیا۔ اس مجہول نظریہ کی رو سے تاج برطانیہ نے بغیر کسی قانونی جواز کے محض فوجی قوت کی برتری کی بنیاد پر خود کو سارے ہندوستان کا مقتدر اعلیٰ حاکم کے مقام پر فائز کر لیا۔ یوں ساری دیسی ریاستیں غلامی کی زنجیر میں جکڑ دی گئیں۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر سلطنت آصفیہ قانونی طور پر آزاد ہونے کے باوجود عملاً تاج برطانیہ کی باج گزار ریاست بن گئی۔

حیدر آباد کے اہم ساحلی اور اندرون ساحل علاقے جیسے شمالی سرکار، راجمندری، مچھلی پٹن، نظام پٹن، گنٹور، کڑپہ، کرنول، بلاری، بالا گھاٹ، سریکا کلم، کرناٹک، بیجاپور، بھدرا چلم اور برار وغیرہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیئے گئے تھے ان کی نوعیت معاہدات کی بنیاد پر حسب ضرورت سلطنت آصفیہ کی حفاظت اور امداد کے عوض جاگیرات جیسی تھی۔ لیکن تاج برطانیہ نے ان معاہدات کی نوعیت کو یکسر بدل دیا اور بہ حیثیت حاکم اعلیٰ ریاست حیدر آباد کو ایک باج گزار ریاست کا درجہ دیا۔ نظام میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ برٹش انڈیا کو چیلنج کر کے اپنے حق کو تسلیم کروائے۔

ڈاکٹر سید داود اشرف نے نواب صاحب چھتاری کی سوانح عمری 'یادایام' سے ایک اقتباس دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ برٹش انڈیا کا سلوک ریاست حیدر آبا سے کس نوعیت کا تھا چھتاری صاحب لکھتے ہیں۔ "ریاست کے صدر اعظم (وزیر) کا تقرر نظام کرتے تھے۔ مگر وائسرے کے مشورے سے۔ یہی وجہ تھی کہ ریاست حیدر آباد کا صدر اعظم حکومت برطانوی ہند کے اثر سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ روایت بہت قدیم تھی۔ بعد ازاں ریاست کے نظم ونسق میں انگریزوں کی مداخلت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ آصف سابع نے کسی ناسمجھ مشیر کے مشورے سے لارڈ ریڈنگ وائسرے ہند کو ایک خط لکھا جس میں سابق معاہدات کی بنیاد پر حکومت ریاست حیدر آباد کا حکومت برطانوی ہند کے ساتھ برابری کا مرتبہ تسلیم کرانا چاہا۔ یہ بات انگریزی حکومت کو گراں گزری.......... لارڈ ریڈنگ نے آصف سابع کے خط کا سخت جواب دیا۔ جس میں اس نے واضح کیا کہ آصف

سابع کی حیثیت دیگر والیان ریاست کے برابر ہے اور برطانوی حکومت سے مساوات اور برابری کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد نظام کے اختیارات پر مزید پابندیاں لگا دی گیں۔ اس خط و کتابت سے قبل صرف صدر اعظم کا تقرر وائسرائے کے مشورہ سے ہوتا تھا مگر اس کے بعد کابینہ کے وزرا کے تقرر میں بھی ریزیڈنٹ کا مشورہ لازمی ہو گیا۔[31] یعنی برٹش انڈیا نے نظام پر اپنے حلقہ اثر کے بیوروکریٹس کو مسلط کر دیا۔

مسلم حکمران اور غیر مسلم اکثریت

دوسری جنگ ترائین میں کامیابی کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان میں پٹھانوں کی حکومت قائم کی۔ اگر چہ پٹھان نسلی، تہذیبی اور بدھ مت کی مشترکہ روایات کی بنا پر ہندوستانی آریاؤں سے برادرانہ رشتہ رکھتے تھے لیکن مذہبی اعتبار سے وہ مسلمان تھے۔ سو سال کے اندر اندر مسلمانوں کے قدم دکن میں پہنچ گئے۔ حسن گنگو بہمنی نے دکن سے سلاطین دہلی کے اقتدار کو ختم کر کے خود مختار بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت سے لے کر میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع (ساتویں) تک دکن مسلمان حکمرانوں کے زیر نگیں رہا۔ اس پورے سات سو سال کے دوران دکن میں مسلمان اقلیت میں رہے۔ آج کے مورخ کو یہ سوال پریشان کرتا ہے کہ غیر مسلم رعایا نے مسلمان حکمرانوں کو اتنی طویل مدت تک کیوں برداشت کیا؟ اس سوال کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان یوں کہ اکثر مورخ تاریخی فہم و بصیرت کو کام میں لا کر غور و فکر کے بغیر فیصلہ کرتے ہیں کہ شاہی دور میں جبر مسلسل کی کارفرمائی نے زبانوں پر تالے ڈال دیئے تھے۔ آواز اُٹھاتے تو سر قلم کر دیے جاتے۔ اور مشکل یوں کہ تاریخ کو اس دور کے چوکھٹے میں رکھ کر معاشی اور معاشرتی عوامل کا مطالعہ ایک دشوار مرحلہ ہے۔ چنانچہ اس صبر آزما راستے کو ترک کر کے آسان جواب کے ذریعہ جان چھڑالی جاتی ہے۔ چاہے اس عمل سے تاریخ مسخ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ آیئے دیکھتے ہیں ریاست حیدر آباد کے مسلم حکمران کے زیر اقتدار غیر مسلم اکثریت کا کیا موقف تھا۔

سلطنت آصفیہ کو ہندوستان میں بہ ظاہر مسلم اقتدار کا مظہر اور مغل دور کا آخری چراغ

تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ تخت سلطنت پر مسلمان حاکم بیٹھے رہے۔ لیکن معاشی اعتبار سے غیر مسلم ریاست کے قدرتی وسائل اور زرائع آمدنی پر ہر وقت چھائے رہے۔ مغلیہ دور اور اس سے پہلے سلاطین دہلی کے دور میں سارے ہندوستان میں یہی صورت حال تھی۔ ۲۲۴ سال کے عرصے میں آصفیہ تخت سلطنت پر سات حکمران مسند نشین ہوئے۔ وہیں دیوانی اور وزارت کے عہدے پر سات غیر مسلم بھی فائز رہے [۱۴] یعنی سیاسی اعتبار سے کاروبار جہاں بانی میں غیر مسلم برابر برابر شریک رہے۔ اس کے برخلاف کشمیر کی صورت حال قابل توجہ ہے۔ جہاں مسلم اکثریت تھی اور سو سال تک ڈوگرا راج قائم رہا۔ اس پورے عرصے میں ڈوگرا حاکموں نے کسی مسلمان کو وزارت کے عہدہ تک پہنچنے نہیں دیا۔ اس ریاست کا پہلا وزیر آعظم وہ بھی کانگریس کی ایما پر اور پنڈت نہرو کے دباؤ میں آزادی ہند کے بعد شیخ عبداللہ کو بنایا گیا۔ مہر چند مہاجن اس وقت ریاست کے وزیر آعظم تھے جن کے خلاف زبردست عوامی احتجاج کے باوجود مہاراجہ نے انھیں وزارت کے عہدہ پر برقرار رکھا اور شیخ عبداللہ کو انتظامی امور کا ناظم مقرر کیا۔ اس بارے میں شیخ عبداللہ کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

”مہر چند مہاجن بدستور وزیر آعظم رہے لیکن مہاراجہ (ہری سنگھ) نے مجھے انتظامیہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا اور میں نے ۳۰ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں میں اپنے عہدے کا حلف لیا...... دسمبر ۱۹۴۷ء میں پہلی عوامی کابینہ بنائی گئی۔ مہر چند مہاجن کو نکال کر مجھے وزیر آعظم بنایا گیا۔ ۱۸۴۶ء کے بعد ریاست میں ۲۸ وزیر آعظم بنائے گئے تھے۔ مگر میں پہلا کشمیری مسلمان تھا جو اس عہدے پر فائز ہوا تھا۔“ [۱۵]

کشمیر میں قانوناً مسلمانوں پر فوج کے دروازے ہمیشہ بند رہے۔ عہد وسطیٰ میں بر شکی قبائل کے مسلمان کسان خصوصاً قراقرم کے نشیبی علاقوں کی زمینات کے مالک تھے۔ بیسویں صدی کے آتے آتے ان کسانوں کو زمینات سے پوری طرح بے دخل کر دیا گیا۔ رابرٹ تھراپ نے ”کشمیر ناجائز حکومت“ کے عنوان سے جو کتاب تحریر کی تھی اس میں کشمیر کے چند قوانین کا حوالہ دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مسلم اکثریت کی ریاست میں ایک غیر مسلم حکمران کا طرز حکمرانی کیا تھا۔ رابرٹ تھراپ لکھتے ہیں۔

"سری نگر میں شاہی چشمے سے روز آنہ پینے کا پانی شاہی محل لے جایا جاتا تھا۔ اس وقت سڑکوں پر کسی مسلمان کو نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ وادی میں کسی مسلمان کو گھر کے اندر ۶ انچ سے بڑا چاقو رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وادی میں جمعہ کی نماز میں مسجد کے اندر بھی خطبہ پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ۱۶ وغیرہ وغیرہ

اس کے مقابل ریاست حیدرآباد کے مسلم حکمرانوں نے اندرون ریاست ایسے نظم ونسق کی بناڈالی جو بلا امتیاز مذہب وذات ساری رعایا کے لئے ترقی اور خوش حالی کا ضامن تھا۔ ریاست کے اندر مکمل مذہبی آزادی تھی۔ حکمران مذہبی معاملات میں بالکل مداخلت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مذہبی امور کی دیکھ بھال کے لئے محکمہ امور مذہبی کے نام سے ایک محکمہ تھا جو اس بات کی نگرانی کرتا تھا کہ مختلف مذاہب کے امور کی انجام دہی اس مذہب کے اُصولوں کے مطابق ہو۔ اس محکمہ کی نگرانی میں ۳۲ ہزار منادر ۵ ہزار مساجد اور ۱۱۰ چرچ تھے۔ حکومت کی جانب سے ۵ ہزار مسلم اداروں کے مقابل ۱۲ ہزار ہندو اداروں کو مالی امداد دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۲۵ مسلم ادارے، مساجد، مقبرے اور عاشور خانوں کا انتظام بالکل ہندو منتظموں کے ہاتھ میں تھا۔ جنھیں حکومت کی طرف سے موروثی معاش مقرر تھی۔ مساجد کے امام، مندر کے پجاریوں، برہمن شاستریوں اور بھجن گانے والوں کو سرکار کی طرف سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ ریاست حیدرآباد کے باہر بھی مندروں کو مالی امداد دی جاتی تھی۔ مدراس کے بھدرا چلم مندر، چنگل پیٹھ مندر، برار کے بالاجی مندر، اور شولا پور کے مہندر مندر ریاست کی امداد سے مستفید ہوتے تھے۔ مسلم اداروں کے ۱۰ ہزار روپیہ سالانہ امداد کے مقابل ہندو اداروں کو تقریباً ایک لاکھ روپیوں کی امداد ملتی تھی۔ ہندو منادر کے لئے ۲ لاکھ ایکڑ سے زیادہ اراضی جاگیر اور معاش کی صورت میں دی گئی تھی۔ ۱۷ معاشی لحاظ سے حیدرآباد کی خوش حالی ضرب المثل تھی۔ معیشت کے تمام ذرائع پر ہندو قابض تھے بدر شکیب نے "حیدرآباد کے عروج وزوال" نامی کتاب کے ۸۸ اور ۸۹ صفحات پر ۱۹۳۱ء کے اعداد

وشمار دیے ہیں جنھیں یہاں پیش کے جاتے ہیں۔

ریاست کی آبادی ایک کروڑ جونسٹھ لاکھ میں مسلمان ۳۰ لاکھ (۱۸ فیصد)، پست اقوام ۶۰ لاکھ (۳۶ فیصد) ہندو ۶۷ لاکھ (۴۱ فیصد) اور سکھ، عیسائی اور پارسی ۷ لاکھ (۵ فیصد) تھے۔ ۴۱ فیصد ہندو آبادی کا معیشت میں کیا حصہ تھا ملاحظہ فرمائیے۔

شعبہ معیشت میں مذہبی طبقات کا فیصد تناسب

شعبہ معیشت	ہندو	مسلمان	غیر مسلم طبقے بشمول پست اقوام
زراعت	۸۷	۸	۵
صنعت	۹۲	۵	۳
ذرائع حمل ونقل	۷۹	۱۲	۹
تجارت	۸۵	۱۳	۲
فوج اور پولیس	۷۴	۲۲	۴
سرکاری ملازمت	۶۵	۳۲	۳
پیشے اور حرفتیں	۷۱	۲۳	۶
خانگی ملازمت	۶۸	۲۵	۷
دوسرے مختلف پیشے	۸۴	۱۰	۶
آبادی کا تناسب	۴۱	۱۸	۴۱ (۳۶+۵)

یہ اعداد وشمار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ریاست کے مسلم حکمرانوں نے ریاست کے قدرتی وسائل اور ذرائع آمدنی سے کسی مخصوص مذہبی طبقے کو بے دخل کر کے اپنے ہم مذہب طبقے کو نوازنے کے لئے حاکمانہ اختیارات کا استعمال نہیں کیا۔ اس لئے ریاست کی معیشت میں ہر طبقہ اپنی خداداد صلاحیت کے مطابق اپنی کوششوں کا پھل پاتا رہا لیکن ایک کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے وہ یہ کہ حکومت نے پست اقوام کی سماجی اور معاشی پس ماندگی کو

دور کرنے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی۔ اگر چہ کہ میر عثمان علی خان کے دور حکومت میں پست اقوام میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اور پست اقوام اور پس ماندہ اقوام کے لئے تعلیمی اداروں، خاص طور پر اعلیٰ تعلیمی میدان اور سرکاری ملازمتوں میں مختص اسامیوں کے پروگرام شروع ہو چکے تھے لیکن کوئی بڑی تبدیلی ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھی۔

سقوط حیدرآباد پس منظر

تحریک آزادی ہند جو کانگریس کے جھنڈے تلے چلائی جارہی تھی وہ ذمہ دارانہ حکومت کے مطالبہ پر مبنی تھی۔ ذمہ دارانہ حکومت کا مطلب یہ تھا کہ اقتدار عوام کو منتقل کیا جائے یعنی آزاد ہندوستان کا سیاسی ڈھانچہ جمہوری ہوگا۔ عوام کے منتخب نمائندے حاکم تصور کے جائیں گے۔ کانگریس اس پالیسی کو ابتداً برٹش انڈیا تک محدود رکھے ہوئے تھی۔ ہندوستان کا ۶۰ فیصد حصہ برٹش انڈیا تھا جو ۱۱ صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور وہ ہیں ۱۔ بمبی، ۲۔ مدراس، ۳۔ اڑیسہ، ۴۔ بہار، ۵۔ بنگال، ۶۔ آسام، ۷۔ یوپی، ۸۔ سی پی، ۹۔ سندھ، ۱۰۔ پنجاب، اور ۱۱۔ صوبہ سرحد۔ باقی ۴۰ فیصد حصے میں ۵۶۲ دیسی ریاستیں تھیں جن میں حیدرآباد، کشمیر، میسور، بڑودہ، بھوپال، پٹیالہ، جودھپور، جے پور، راجکوٹ، بیکانیر اور جونا گڑھ قابل ذکر تھیں۔ [۱۸]

دیسی ریاستوں کے بارے میں کانگریس نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ کانگریس عدم مداخلت کی پالیسی پر ۱۹۳۷ء تک قائم رہی۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولیوشن پاس کیا جس کی منظوری ہری پور کانگریس سیشن میں حاصل کی گئی۔ اس ریزولیوشن کے ذریعہ دیسی ریاستوں میں بھی ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تا کہ دیسی ریاستوں میں شخصی اقتدار کی جگہ جمہوری حکومت قائم ہو جائے۔ اس پالیسی کے اعلان کے بعد ان ریاستوں میں جہاں کے سربراہ مسلمان بادشاہ تھے لیکن مسلمان اقلیت میں تھے اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ان ریاستوں میں خاص کر حیدرآباد، بھوپال اور جونا گڑھ قابل ذکر ہیں۔ کشمیر کے حالات بالکل مختلف تھے۔ وہاں مسلم اکثریت

تھی لیکن حکمران ہندو راجہ تھا چنانچہ حیدر آباد کے مسلم حکمران اور کشمیر کے ہندو حکمران کو اپنے اپنے اقتدار کے خاتمے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔

۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں کیبنٹ مشن کی سفارشات کا اعلان کیا گیا۔ اس کے مطابق دیسی ریاستوں کے سربراہوں کو ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کو اطلاع دی گئی کہ جب ہندوستان آزاد ہوگا تو پیرامونٹسی (اقتدار اعلیٰ) جو دیسی ریاستوں پر مسلط تھا وہ ہندوستان اور پاکستان کو منتقل نہیں کیا جائے گا اور دیسی ریاستیں اس حالت کو لوٹ جائیں گی جو معاہدات سے قبل تھی۔ یعنی دیسی ریاستیں تاج برطانیہ کے تسلط سے نکل کر خود بخود ہندوستان یا پاکستان کے تسلط میں نہیں آجائیں گی بلکہ وہ آزاد ہو جائیں گی۔ اس سفارش کو قانون آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء میں دفعہ ۷ کے تحت شامل کر لیا گیا۔ اس قانون کی دفعہ ۷ کے مطابق تاج برطانیہ کو چاہیئے تھا کہ معاہدات کے ذریعہ نظام سے حاصل کردہ سارے علاقے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے عملاً نظام کے تسلط میں دے دیتے۔ یہ انگریزوں کی اخلاقی ہی نہیں بلکہ قانونی ذمہ داری بھی تھی۔ چنانچہ انگریزوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلانے کی خاطر میر عثمان علی خان نے نمائندہ تاج برطانیہ کے نام ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کے ذریعہ سے مطالبہ کیا گیا کہ حیدر آباد کو ایک آزاد ریاست تسلیم کر کے اس کو نو آبادیاتی درجہ دیا جائے۔ معاہدات کے ذریعہ حاصل کردہ علاقوں کو ریاست حیدر آباد کے حوالے کئے جائیں۔ اور ریاست کو برطانوی دولت عامہ میں شرکت کا موقعہ دیا جائے۔ نظام کے اس خط کے جواب میں برطانوی نمائندے نے خاموشی اختیار کی۔

اب نظام کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ قانون آزادی ہند ۴۷ کی دفعہ ۷ کے مطابق انھیں فیصلہ کرنا تھا کہ ہندوستان یا پاکستان میں شرکت کرنا چاہیے یا آزاد رہنا ہے۔ نظام نے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا اور ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد کی آزادی کا فرمان جاری کیا اور ہندوستان و پاکستان دونوں ممالک سے دوستانہ معاہدہ کی خواہش ظاہر کی۔ اس پالیسی کو عملی شکل دینے کی خاطر انھوں نے ایک وفد نواب چھتاری، علی یاور جنگ اور سر والٹر مانکٹن پر مشتمل ۱۱ جولائی

۱۹۴۷ءکو دہلی روانہ کیا۔ اس وفد میں عوامی نمائندوں کے دو وزرا عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ رام ریڈی بھی شامل کے گئے۔ گفتگو کے لئے تین امور طے کے گئے۔ ۱۔ استرداد (واپسی) برار ۲۔ حیدرآباد کو ڈومینین اسٹیٹ کا درجہ یعنی ہندوستان اور پاکستان کے مماثل آزاد مملکت کا موقف اور ۳۔ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے ہندوستان سے وفاق۔ ماؤنٹ بیٹن نے ان تینوں امور کے تعلق سے صاف کہہ دیا کہ برار کی واپسی بغیر عوام کی مرضی کے ممکن نہیں۔ دولت مشترکہ میں شرکت جب تک ہندوستان یا پاکستان میں شرکت نہ ہو ممکن نہیں۔ اور ہندوستان سے وفاقی الحاق کے بارے میں کہا گیا کہ حیدرآباد ۳امور یعنی دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کی حد تک ہندوستان میں شرکت کر لے۔ گفتگو اس وقت کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء میں برطانیہ تقسیم ہند کے بعد دیسی ریاستوں کے معاملات کو معلق چھوڑ کر اسٹیج سے غائب ہو گیا۔ دیسی ریاستوں کی فریاد سننے اور قانون آزادی ہند ۴۷ دفعہ ۷ کی دونوں آزاد مملکتیں اگر خلاف ورزی کریں تو انھیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نے آزادی کا اعلان تو کر دیا لیکن آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں حکومت ہند سے دوستانہ معاہدہ یا صلح نامہ جو بھی ہو کرنا ضروری تھا۔ دوسرا راستہ فوجی حملے کی صورت میں موثر دفاع کے لئے تیار ہونے کا تھا۔ ہندوستان کی برتر فوجی طاقت کا مقابلہ ریاست حیدرآباد کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس لئے نظام نے ہندوستان سے دوستانہ معاہدہ کی کوشش شروع کر دی۔ اس کام کے لیے ایک دوسرا وفد دہلی روانہ کیا گیا۔ گورنر جنرل ہند ماونٹ بیٹن سے ملاقات اور مذاکرات کے دوران وفد نے گورنر جنرل کو یقین دلایا کہ نظام نے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کی منظوری دے دی ہے۔ اور معاہدہ شرائط شرکت Instrument of Accession کے بجاے معاہدہ مفاہمت یا دوستی Articles of Association کے لئے تیار ہیں۔ حکومت ہند ۳ماہ تک ٹال مٹول کرتی رہی۔ اس لیے کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل معاہدہ شراکت کے لئے مصر تھے۔ انھیں دنوں جوناگڑھ کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ جوناگڑھ نے پاکستان میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا اور نہایت

راز میں پاکستان سے معاہدے کی تیاریاں جاری تھیں کہ شہنواز بھٹو نے اس کی اطلاع وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کو دے دی۔ اور حکومت ہند نے فوری فوجی کاروائی کر کے جونا گڑھ پر قبضہ کرلیا۔ جس کی وجہ سے پاکستان سے جنگ کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اُدھر کشمیر کا معاملہ بھی الجھا ہوا تھا۔ چنانچہ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری وی پی مینن نے سردار پٹیل کو مشورہ دیا کہ شمال کے ان خراب حالات کی بنا پر جنوب میں حیدرآباد سے لڑائی مول لینا بہتر نہیں ہے لہٰذا کوئی عارضی معاہدہ کرلیا جائے۔ حیدرآباد کے الحاق کے بارے میں اطمینان سے سوچا جا سکتا ہے۔ سردار پٹیل راضی ہو گئے اور مزید ۳ ماہ کی گفتگو کے بعد آخرش ۲۸/نومبر ۱۹۴۷ء کو حکومت ہند اور نظام کے درمیان ایک معاہدہ تکمیل پایا۔ اس معاہدہ کو معاہدہ انتظام جاریہ Stand Still Agrement کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کی پانچ دفعات تھیں [19]

۱۔ نئے انتظامات یا معاہدات تک وہ سارے مشترکہ معاملات اور انتظامی امور بشمول اُمور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے ضمن میں دونوں حکومتوں کے تعلقات ان ہی بنیادوں پر قائم رہیں گے جو تاج برطانیہ اور نظام کے درمیان ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے قبل تھے۔ مگر حکومت ہند کو یہ حق نہ ہوگا کہ اندرونی شورش اور امن کی برقراری کے لئے فوج روانہ کرے یا فوجی امداد دے۔ بجز زمانہ جنگ کے حکومت ہند کوئی فوج ریاست کے اندر نہیں رکھے گی۔

۲۔ دونوں حکومتوں نے اتفاق کیا کہ اس معاہدہ کی بہتر عمل آوری کے لئے حیدرآباد اور دہلی اپنے ایجنٹ مقرر کریں گے اور انھیں تمام سہولتیں مہیا کریں گے۔

۳۔ حکومت ہند کسی امر میں پیراموئنٹسی (اقتدار اعلیٰ) کے اختیارات استعمال نہیں کریگی۔

۴۔ کوئی نزاع جو اس معاہدہ یا ایسے معاہدات اور انتظامات کے تعلق سے پیدا ہو تو تصفیہ ثالثی کے سپرد کیا جائے گا۔

۵۔ معاہدہ فی الفور نافذ العمل ہوگا اور ایک سال تک نافذ العمل رہے گا۔

معاہدہ میں جو ضمیمے شامل کئے گئے تھے ان میں نظام نے واضح کیا تھا کہ وہ کسی صورت

مستقل طور پر اپنی آزادی سے دست بردار نہیں ہو رہے ہیں۔ البتہ چند معاملات میں اپنے اختیارات کو عارضی طور پر معطل کر رہے ہیں جیسے غیر ممالک میں سفارتی اور تجارتی نمائندوں کا تقرر، اسلحہ کی فراہمی اور فوج کی عصری بنیاد پر تربیت، کرنسی، سکہ اور ٹپہ (ڈاک) کے حقوق وغیرہ وغیرہ۔

یہ معاہدہ حیدرآباد کی آزادی اور اس کے مفادات کی بڑی حد تک پابجائی کرتا تھا۔ البتہ اس کا دفعہ ۵ سقوط حیدرآباد کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ حکومت ہند سے بجائے ایک سال کا معاہدہ جاریہ حاصل کرنے کے انھیں دفعات پر مشتمل ایک مستقل معاہدہ حاصل کر لینا دشوار نہ تھا، کیونکہ اس وقت قائداعظم محمد علی جناح تاحیات تھے۔ ہندوستانی فوجیں کشمیر میں الجھی ہوئی تھیں۔ حکومت ہند نے جوناگڑھ میں فوجی کاروائی کر کے حالات کو اور بگاڑ دیا تھا۔ اور نظام کے پاس ایک ٹرمپ کارڈ موجود تھا۔ وہ پاکستان میں شرکت کی دھمکی دے کر حکومت ہند کو مستقل معاہدہ کرنے کے لئے مجبور کر سکتے تھے۔ لیکن وفد کے سیاسی مشیروں اور خود نظام نے سیاسی تدبیر کا ثبوت نہیں دیا۔ حکومت ہند سے ایک سال کا معاہدہ جاریہ حاصل کر کے سمجھ بیٹھے کہ انھوں نے مستقل آزادی کا پروانہ حاصل کر لیا ہے۔ اور اس خوش فہمی میں پھر سے خواب غفلت کی نیند سو گئے۔

معاہدہ انتظام جاریہ کے قریب ۳ ماہ گزرنے کے بعد ریاست کی جانب سے مستقل معاہدہ کے لئے کوششیں شروع کی گئیں۔ اس وقت حالات بدل چکے تھے۔ ہندوستان نے کشمیر میں قدم جما لیے تھے۔ بدامنی اور فسادات پر قابو پا لیا گیا تھا۔ دیسی ریاستوں کے الحاق کے سارے مسائل حل ہو چکے تھے۔ اب حکومت ہند فوج کو حسب ضرورت کسی بھی علاقے میں روانہ کر سکتی تھی۔ اس دوران سرحدی شورشوں، سخت معاشی ناکہ بندی اور مبالغہ آمیز پروپگنڈہ کے ذریعہ حیدرآباد پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ شرکت پر راضی ہو جائے۔ اس کام کے لئے اسٹیٹ کانگریس نے ریاست کے باہر سرحد سے متصلہ صوبوں میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا، بمبی، مدراس، ناگپور، شولاپور، اور دیگر شہروں میں مراکز قائم کئے جہاں

سے مقامی زبانوں میں حیدر آباد کے خلاف پمفلٹ شائع کیے جانے لگے۔ اور مقامی اخباروں کو اشتعال انگیز خبریں فراہم کی جاتی تھیں۔ وی پی مینن ۲۳ مارچ ۱۹۴۸ء کو ایک مراسلہ معاہدہ جاریہ کی دفعات کے خلاف ورزیوں کے تعلق سے لکھا جس کا لب ولہجہ دھمکی آمیز تھا۔ شکایت کا پہلا فقرہ پاکستان کو ۲۰ کروڑ روپیہ کے قرض اور کراچی میں پبلک ریلیشن آفیسر کے تقرر سے متعلق تھا۔ دوسرا دفاع کے بارے میں تھا کہ فوج کی مقررہ تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان مخدوش حالات کے باوجود حیدر آباد نے مستقل معاہدہ حاصل کرنے کے لئے مارچ ۱۹۴۸ء سے جون ۱۹۴۸ء تک مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ریاست حیدر آباد جلد از جلد مستقل معاہدہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن حکومت ہند ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی حکومت ہند مستقل معاہدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے فوجی کاروائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن فوجی کاروائی کرنے کے لئے کچھ مہلت درکار تھی۔ میجر جنرل جے این چودھری نے جنھیں حیدر آباد پر حملہ کرنے والی فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تھا۔ حکومت ہند کو مشورہ دیا تھا کہ حیدر آباد کو چند مہینے تک گفتگو میں الجھائے رکھے۔ چنانچہ جنرل چودھری اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں۔

> ''مئی کے وسط تک آرمرڈ ڈویژن اپنی پوری نفری جمع نہ کر سکا۔ اس کی قوت کا بڑا حصہ اب بھی پونا، دھوند، احمد نگر، بنگلور اور اوندھ میں بکھرا ہوا اور زیر تربیت تھا۔ یہ صورت حال میرے لئے انتہائی پریشان کن تھی۔ میرے ماتحت جتنے بھی اسٹاف اور سروس آفیسر تھے سب کے سب نوجوان اور غیر تربیت یافتہ تھے اور آنے والے حالات کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے خوف کھا رہے تھے۔ میں نے ان تمام حالات کی رپورٹ گورنمنٹ آف انڈیا کو ارسال کی اور گورنمنٹ نے وقت گزارنے کا بہترین طریقہ اختیار کیا۔ حکومت حیدر آباد کو زیادہ سے زیادہ دیر تک سیاسی مذاکرات اور سرکاری سطح کی گفتگو میں الجھائے رکھے۔[20]

اس پورے اقتباس سے یہ کہیں نہیں ظاہر ہوتا کہ حکومت ہند معاہدہ انتظام جاریہ کی مدت پوری ہونے کا انتظار کرنے والی تھی۔ معاہدہ انتظام جاریہ نومبر ۱۹۴۷ء کو نافذ ہوا تھا۔ اور اکتوبر ۱۹۴۸ء تک حکومت ہند قانوناً فوجی کاروائی کی مجاز نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کا جاسوسی نظام انتہائی ناقص تھا۔ وہاں فوجی حملہ کی تیاری ہو رہی تھی اور یہاں مستقل معاہدہ حاصل کرنے کی کوشش۔ چنانچہ معاہدہ انتظام جاریہ کی دفعات میں متعدد ترمیم کے بعد ایک قابل قبول معاہدہ کی تفصیلات لے کر میر لائق علی وزیر اعظم، سر والٹر مانکٹن، وینکٹ رام ریڈی اور عبدالرحیم پر مشتمل وفد دہلی روانہ ہوا۔ اور ۷ جون ۱۹۴۸ء کو ماونٹ بیٹن سے مل کر معاہدہ کا مسودہ پیش کیا۔ ماونٹ بیٹن نے پھر اپنا پیترہ بدلا[۱۲] اور کہا کہ حیدرآباد کی ہندو رعایا ایسا معاہدہ قبول نہیں کرے گی۔ وہ سوائے الحاق کے کسی اور معاہدہ کو قبول نہیں کرے گی۔ اس مسئلہ کو جمہوری طریقہ سے حل کرنا ہوگا۔ اور وہ استصواب عامہ (Plebiscite) کا مروجہ طریقہ کار ہے۔ لہٰذا ریاست کی ہندو اور مسلمان رعایا کو یہ حق دینا چاہیئے کہ وہ عوامی ووٹ کے ذریعہ اپنا فیصلہ دیں۔ کیا وہ ہندوستان سے الحاق چاہتے ہیں یا ایک مسلم حکمران کے زیر حکومت آزاد رہنا پسند کرتے ہیں۔ لائق علی صاحب کے لئے وہ ایک آزمائش کی گھڑی تھی۔ ویسے وہ استصواب عامہ کے امکان پر غور کر چکے تھے اور اس کا جواب بھی انھوں نے سوچ لیا تھا۔ اسی لئے ماؤنٹ بیٹن کے سامنے انھوں نے نہایت حیرت آمیز سیاسی تدبر کا ثبوت دیا اور بلا جھجک نظام کی منظوری کے بغیر استصواب عامہ کے ذریعہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کروانے کے لئے اپنی طرف سے منظوری دے دی۔ ماؤنٹ بیٹن کو توقع نہ تھی کہ حیدرآباد کا وفد استصواب عامہ کے لئے تیار ہو جائے گا۔ ماؤنٹ بیٹن بے انتہا خوش ہو گئے اور اس تجویز کے تعلق سے میٹنگ کی تفصیلی روئیداد حکومت ہند کو روانہ کر دی۔

جب یہ روئیداد حکومت ہند کے ایوانوں میں پہنچی تو کیا ہوا۔ اس کے تعلق سے جناب سید حسین صاحب نے ایک مبسوط نوٹ تحریر کیا ہے جس سے حکومت ہند کے رویہ کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے۔ سید حسین صاحب لکھتے ہیں۔

''جب یہ روئیداد حکومت ہند کے ایوانوں میں پہنچی تو کھلبلی مچ گئی۔ نہرو پریشان ہوئے کہ حیدرآبادی وفد نے استصواب عامہ کی تجویز قبول کر کے بڑا وار کیا ہے۔ اور یہ کہ استصواب عام کا نتیجہ حیدرآباد کی آزادی میں آجائے تو حکومت ہند کا سارا منصوبہ ختم ہو جائے گا۔ حکومت ہند خاص طور پر نہرو اور پٹیل اس حقیقت سے واقف تھے کہ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس، ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج نے ملکر جو عوامی احتجاج کے بلند بانگ دعوے کئے تھے اور جسے حیدرآباد کے باہر پریس خاص طور پر ٹائمس آف انڈیا اور حکومت ہند کے ذرائع ابلاغ نے خوب اچھال کر یہ تاثر دیا تھا کہ حیدرآبادی عوام موجودہ سیاسی نظام کے خلاف اور ذمہ دارنہ حکومت کے موافقت میں ہیں۔ استصواب عامہ کی صورت میں صورت حال یہ تھی کہ مسلمان کے علاوہ شیڈولڈ کاسٹ (پست اقوام یا دلت) اور قبائلی (جو آبادی کا ۳۶ فیصد تھے) کا ایک بڑا طبقہ جو اپنے رہنما وینکٹ راؤ کے ساتھ تھا، خود کمیونسٹ (جن پر سے مئی ۱۹۴۸ء میں تحدیدات اُٹھالی گئی تھیں) اور ہندوؤں کا وفادار طبقہ حکومت حیدرآباد کی مخالفت اور حکومت ہند کے موافقت میں نہ تھا۔ خاص طور پر دیہاتی عوام جن پر مبالغہ آمیز پروپگنڈہ اور ستہ گرہ کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا اور حکومت حیدرآباد کے موجودہ نظام سے بالکل خوش تھے بادشاہ کے خلاف نہیں تھے۔ ۹۰ فیصد سے زیادہ عوام موجودہ نظام کے موافق تھے۔ اس لحاظ سے استصواب عامہ کا نتیجہ حیدرآباد کی موافقت میں آنے کا یقین تھا۔ [۲۱]

چنانچہ استصواب عامہ کی تجویز کو واپس لے لیا گیا۔ اور حیدرآبادی وفد کو مطلع کیا گیا کہ کامل الحاق کے علاوہ حکومت ہند کسی اور تجویز پر غور نہیں کر سکتی۔ خود ماؤنٹ بیٹن نے حیدرآبادی وفد سے گفتگو کر کے انھیں مطلع کیا کہ حکومت ہند کی فوج سرحدوں کے قریب ہے اور تین گھنٹوں میں سرحد پار کر سکتی ہے۔ گورنر جنرل ہند حیدرآباد کو فوجی کاروائی کی دھمکی

دے رہے تھے۔ یہ جون ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ انھوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ ریاست حیدرآباد نے معاہدہ انتظام جاریہ کے کس دفعہ کی خلاف ورزی کی تھی کہ معاہدہ کی مدت (اکتوبر ۱۹۴۸ء) ختم ہونے سے پہلے فوجی کاروائی کی دھمکی دی جا رہی ہے۔ حکومت ہند نے پچھلے معاہدہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ فوجی برتری کے بل بوتے پر حیدرآباد کی آزادی کا گلا گھوٹنے کی نہ صرف تیاری کرتی رہی بلکہ علانیہ دھمکی آمیز رویے کا برملا اظہار کر کے ثابت کر دیا کہ وہ حیدرآباد کی آزادی کو تسلیم ہی نہیں کر رہی تھی۔ اس طرح سے حکومت ہند قانونِ آزادی ہند ۴۷ کی دفعہ ۷ کی خلاف ورزی کی بھی مرتکب ہوئی تھی۔

۲۱؍جون ۱۹۴۸ء کو ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد لنڈن چلے گئے۔ ماؤنٹ بیٹن کے جانے کے بعد پنڈت جواہر لعل نہرو وزیرِ اعظم ہند نے حیدرآباد سے مذاکرات کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ اس کے باوجود حکومت حیدرآباد نے نئے گورنر جنرل شری راج گوپال چاری کے ذریعہ سے مسلسل کوشش کرتی رہی کہ کوئی باعزت سمجھوتا ہو جائے۔ لیکن حکومت ہند حیدرآباد کی ہر کوشش کے جواب میں یہی بات دہراتی رہی کہ مکمل الحاق کے علاوہ کوئی اور سمجھوتا ممکن نہیں ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ حکومت ہند کشمیر میں UN رزولیوشن کے مطابق استصواب عام کو قبول کرنے کے باوجود استصواب عامہ کروانے سے گریز کیا۔ یعنی اُسے خدشہ تھا کہ کشمیری عوام حکومت ہند کے خلاف ووٹ دیں گے۔ اور حیدرآباد میں خود حکومت ہند کے بااعتماد گورنر جنرل کی تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔ کیا حکومت ہند خاص طور پر پنڈت جی کو حیدرآباد کے عوام پر بھی اعتماد نہیں تھا؟ اس سوال کا جواب فی الحال ممکن نہیں ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس کے لئے ہمیں حیدرآباد کی معاشرتی زندگی کے مزید چند گوشوں کو سامنے لانا ہوگا جن کا علم پنڈت نہرو کو تھا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے کہ ۸، ۹ سو سالہ دورِ حکومت میں مسلم حکمرانوں نے ایسا طرزِ حکمرانی اپنایا تھا کہ اکثریتی طبقہ غیر مذہبی حاکموں کو اپنا ان داتا تسلیم کرتا رہا۔ سلطنت آصفیہ کے آخری مسلمان حکمران کو ساری رعایا کا ان

داتا ہونے کے باوجود حکومت ہند کی متعصبانہ پالیسی اور زبردست فوجی کاروائی کی وجہ سے ہندوستان کے حق میں اپنے اقتدار سے دست بردار ہونا پڑا۔

سقوط حیدر آباد

حیدر آباد پر حملے کے لئے حکومت ہند ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کی تاریخ مقرر کر چکی تھی۔ پروگرام کے مطابق ۱۱ ستمبر کو فوجی نقل و حرکت شروع ہو چکی تھی کہ قاید آعظم محمد علی جناح کے انتقال کی خبر ملی۔ اس خبر پر جے این چودھری کا تبصرہ عامیانہ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ لکھتے ہیں۔

> "۱۱ ستمبر کو جب کہ ہمارے فوجی دستے حیدر آباد کا فیصلہ کرنے کے لئے حرکت میں آ چکے تھے۔ جناح کے انتقال کے خبر ملی۔ اس خبر سے ہمارے سنیئر اور جونیئر افسروں کے حوصلے خاصے بلند ہو گئے اور ہمیں اپنی منزل پر کامیابی سے پہنچ جانے کا یقین ہو گیا۔ اس موقع پر مجھے صاف کہہ دینا چاہیئے کہ جناح کی موت کا یہ اچانک حادثہ ہمارے لئے نیک فعال ثابت ہوا۔ تاہم حکومت کی ہدایت پر ہم نے بھی ماتم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے جھنڈے سرنگوں کر دیئے۔[۲۲]

۱۲ اور ۱۳ ستمبر کی درمیانی رات تاریک تھی اور فوجی کاروائی کے لیے بہت مناسب۔ میجر جنرل جے۔ این چودھری کی کمان میں ہندوستان کی تقریباً ۶۰ ہزار جدید ہتھیار سے لیس فوج نے بغیر اعلان جنگ کیئے ریاست حیدر آباد پر حملہ کر دیا۔ ہندوستانی فوج نے ریاست کے چاروں طرف بہ یک وقت ۲۲ محاذ کھول دیئے۔ لیکن سب سے بڑا حملہ مغرب میں شولا پور، حیدر آباد شاہراہ اور مشرق میں مچھلی پٹنم کی طرف سے وجے واڑہ، حیدر آباد شاہراہ سے شروع کیا گیا۔ شولا پور کی سمت سے حملہ کرنے والی فوج پانچ دن کے اندر تقریباً ۲۲۰ میل کا فاصلہ طے کر کے پائے تخت حیدر آباد میں داخل ہونے کے موقف میں آ گئی۔ تب نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع نے شہر حیدر آباد کو عظیم تباہی سے بچانے کی خاطر ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ نظام حیدر آباد کے فیصلے کے مطابق شہر سے پانچ میل

کے فاصلے پر شکست خوردہ جنرل العیدروس نے ۱۸؍ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہتھیار ڈالنے کی رسم ادا کی اور حکومت کی باگ ڈور جے این چودھری کے حوالے کر دی گئی۔ ساتھ ہی ۲۲۴ سالہ آصف جاہی سلطنت ختم ہو گئی اور ہندوستان کا آخری مسلمان حکمران حکومت ہند کے حق میں اپنے اقتدار سے دست بردار ہو گیا۔

پانچ روزہ جنگ کی تفصیلات کا احاطہ کرنا اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ اس جنگ کی تفصیلات اور ریاست حیدر آباد کی فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل سعید احمد العیدروس کی غداری، نااہلی اور دفاعی تیاری سے غفلت کی شرمناک داستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا مقصود ہو تو حوالے ۲۲ کی کتاب، ''سقوط حیدر آباد'' سے رجوع کریں۔ خاص طور پر میر لائق علی وزیر اعظم حیدر آباد کا مضمون پانچ روزہ جنگ (صفحہ ۱۱۱) اور جے این چودھری کی خودنوشت آپریشن پولو (صفحہ ۷۴) کا مطالعہ کریں۔ اس کے علاوہ فوجی حملے کے نتیجے میں جو قتل و غارتگری ریاست کے اضلاع میں ہوئی اس کی تفصیلات کے لئے بھی اسی حوالے کی کتاب میں پنڈت سندر لال اور قاضی محمد عبد الغفار کی رپورٹ ''آپریشن پولو کے بعد'' (صفحہ ۲۱۶) ملاحظہ فرمائیں۔

حوالہ جات

۱۔ دکن کی سیاسی تاریخ: سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۲۱: مطبوعہ اسلامک پبلیکشنز لمیٹیڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ طبع سوم جون ۱۹۶۹ء

۲۔ زوال حیدرآباد: سید حسین: صفحہ ۱۸، مطبوعہ سنٹر فار مینار ٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

۳۔ دکن کی سیاسی تاریخ: سید ابوالاعلیٰ مودودی: صفحہ ۲۳، ۲۴ مطبوعہ اسلامک پبلیکشنز لمٹیڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور: طبع سوم جون ۱۹۶۹ء

۴۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۰۷

۵۔ ایضاً۔ صفحہ ۴۱

۶۔ زوال حیدرآباد: سید حسین: صفحہ ۲۱، مطبوعہ سنٹر فار مینار ٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

۷۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۵

۸۔ مملکت آصفیہ جلد اول: مرتب: ڈاکٹر محمد عبدالحئی صفحہ ۱۴۳، ناشر ادارہ محبان دکن ۷ کوئنس کورٹ عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔ طبع اول فروری ۱۹۷۸ء

۹۔ زوال حیدرآباد: سید حسین، صفحہ ۲۰، مطبوعہ سنٹر فار مینار ٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ حیدرآباد۔ دسمبر ۲۰۰۱ء

۱۰۔ حرفِ اعتبار: ڈاکٹر سید داؤد اشرف: صفحہ ۱۱۔ مطبوعہ شگوفہ پبلیکشنز، ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد۔ نومبر ۲۰۰۱ء

۱۱۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۴

۱۲۔ زوال حیدرآباد: سید حسین صفحہ ۲۶، مطبوعہ سنٹر فار مینار ٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ حیدرآباد۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

۱۳۔ حرفِ اعتبار: ڈاکٹر سید داؤد اشرف، صفحہ ۹۴۔ مطبوعہ شگوفہ پبلیکشنز ۳۱، مجرد گاہ معظم جاہ مارکیٹ حیدرآباد۔ نومبر ۲۰۰۱ء

۱۴۔ میر عثمان علی خان اور ان کا عہد: طیبہ بیگم صفحہ ۲۸۵، ناشر ادارہ ادبیات اُردو۔ نومبر ۱۹۹۳ء

۱۵۔ آتش چنار شیخ محمد عبداللہ (خودنوشت سوانح) صفحہ ۴۳۱، ۴۶۴ پبلیشرز علی محمد اینڈ سنز سری نگر کشمیر۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۶ء

۱۶۔ رابرٹ تھراپ: انگریز باپ کرنل تھراپ اور کشمیری دوشیزہ امیرن کا بیٹا تھا۔ رابرٹ تھراپ نے مہاراجہ کشمیر کے ظلم اور ناانصافی کو طشت از بام کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی تھی جس کی پاداش میں اُسے قتل کر کے شیخ باغ کے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ رابرٹ تھراپ کی کتاب دستیاب نہیں ہے کشمیر کے بارے میں مختلف مضامین کے ذریعہ یہ معلومات فراہم ہوئی ہیں۔

۱۷۔ زوال حیدرآباد: سید حسین: صفحہ ۳۱، مطبوعہ سنٹر فار مینار ٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ حیدرآباد۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

۱۸۔ ایضاً۔ صفحہ ۴۳

۱۹۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۱۳

۲۰۔ سقوطِ حیدرآباد: مرتبین: ڈاکٹر عمر خالدی اور ڈاکٹر معین الدین عقیل، صفحہ ۷۷، مطبوعہ دارالاشاعت کل ہند مجلس تعمیر ملت، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد: ستمبر ۱۹۹۸ء

۲۱۔ زوال حیدرآباد: سید حسین دیکھئے باب مستقل معاہدے کی تلاش ۲۱ تا ۱۳۶۔ مطبوعہ سنٹر فار مینار ٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ حیدرآباد۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

۲۲۔ سقوطِ حیدرآباد: ڈاکٹر عمر خالدی اور ڈاکٹر معین الدین عقیل، صفحہ ۹۵، مطبوعہ دارالاشاعت کل ہند مجلس تعمیر ملت، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد: ستمبر ۱۹۹۸ء

جہاں تک کتاب کے تیسرے اور آخری باب بہ عنوان ”سلطنت آصفیہ کا زوال اور سقوطِ حیدرآباد“ کا تعلق ہے، یہ کتاب کا انتہائی بیش قیمت حصہ ہے، جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنی شہہ رگ کے قریب محسوس کرتے ہوئے بھی ایک غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر سے تحریر کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کی یہ کوشش قابل تعریف بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ کئی بار ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے بڑے مورخ بھی جب اپنے آپ سے وابستہ واقعات کا ذکر کرتے ہیں تو جذباتی دھاروں میں بہہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے خود کو اس امتحان میں ڈالا بھی اور کامیابی کے ساتھ نکالا بھی۔

شبیہ احمد
ڈپٹی ڈائریکٹر
انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی

...ublications
... of Qur'an, Religious & Literary Books
..., Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi- 110002
Call: 9810784549, e-mail: abdus26@hotmail.com

ISBN 81-88413-46-1
9788188413461